

الاعراف

نام | اس سورہ کا نام اعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی آیات ۴۱-۴۶ میں اعراف اور اصحاب کا ذکر آیا ہے۔ گویا اسے "سورہ اعراف" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے"۔
 زمانہ نزول | اس کے معنایں پر غور کرنے سے بین طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول تقریباً وہی ہے جو سورہ انعام کا ہے۔ یہ بات تریقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہے یا وہ۔
 مگر اندازہ تقریب سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ اسی دور سے متعلق۔ لہذا اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیکھنا چاہیے کہ اس کا زمانہ نزول کیا ہے اور اس کا جوہر کیا ہے۔

مباحث | اس سورہ کی تقریر کا مرکزی مضمون دعوت رسالت ہے ساری گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈرانی) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطب ہیں (یعنی اہل مکہ)، انہیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور ان کی گراں گوزشی، ہٹ دھرمی اور مخالفتانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عنقریب پیغمبر کو ان سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تقابلی انداز میں قبول رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی روش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کر کے بہت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان پر حجت تمام ہونے کے قریب آگئی ہے اس لیے تقریر کے آخری حصہ میں دعوت کا رخ ان سے ہٹ کر اہل کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دور جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہوا کرتا ہے، خاتمہ پر آگیا ہے۔

دوران تقریر میں چونکہ خطاب کا رخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے اس لیے ساتھ ساتھ دعوت رسالت کے اس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرنے اور سمع و طاعت کا عداستوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو حکمت تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزوں اور چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے مرجان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

آيَاتُهَا ۲۰۶

سُورَةُ الْأَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۲۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمَص ۱ كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ
حَرْجٌ مِّنْهُ لِتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۲

آل، م، ص۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، پس اسے محمدؐ، تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دہانی ہو۔

۱۔ کتاب سے مراد یہی سورۃ اعراف ہے۔

۲۔ یعنی بغیر کسی جھجک اور خوف کے اسے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرو کہ مخالفین اس کا کیسا استقبال کریں گے۔ وہ بگڑتے ہیں، بگڑتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، اڑائیں، طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بنائیں۔ دشمنی میں اور زیادہ سخت ہوتے ہیں، ہرجائیں۔ تم بے کھٹکے اس پیغام کو پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ میں ذرا باک نہ کرو۔

جس مفہوم کے لیے ہم نے لفظ جھجک استعمال کیا ہے، اصل عبارت میں اس کے لیے لفظ حَوْج استعمال ہوا ہے۔ لغت میں حَوْج اُس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مخالفوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رُکے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ضبیق صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً وَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ (الحجر، آیت ۹۷) "اے محمدؐ، ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو، یعنی تمہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد اور ربط دھرمی اور مخالفت حق کا یہ حال ہے انہیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ فَلَعَلَّكَ تَأْسُرُكُ بَعْضُ مَا يَدْعُو إِلَيْكَ وَضَائِقٌ إِلَيْكَ صَدْرُكَ إِنَّ يَقُولُوا لَوْ كَا أَنْزَلَ عَلَيْكَ كِتَابًا وَجَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ (ہود، آیت ۱۲) "تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمہاری دعوت کے جواب میں کہیں گے اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ آتا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا"

۳۔ مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کا اصل مقصد تو ہے اندازہ یعنی لوگوں کو رسول کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتائج سے ڈرانا اور غافلوں کو حزن کا نانا اور متنبہ کرنا، یہی اہل ایمان کی تذکیر زیادہ دہانی، تو وہ ایک ضمنی فائدہ ہے جو اندازہ کے سلسلہ میں خود بخود

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ
 أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مِمَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۳﴾ وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا
 فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ
 دَعْوُهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۵﴾

لوگو، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے
 رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔
 کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت
 ٹوٹ پڑا، یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب ان کو
 آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔

حاصل ہو جاتا ہے۔

۳ یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ اصل دعوت جو اس خطبہ میں دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی بسر
 کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم
 اُسے درکار ہے، اور اپنے اخلاق، تمدن، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے
 ان سب کے لیے اُسے صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اُسی ہدایت کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے
 رسولوں کے ذریعہ سے بھیجی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر
 دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریق کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔
 یہاں "اولیاء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اُسے درحقیقت اپنا اولی
 و سرپرست بناتا ہے خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، خواہ اس کی سرپرستی کا معترف ہو
 یا بد شدت اس سے انکار کرے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الشوریٰ، ساشیبہ ۶)

۴ یعنی تمہاری عبرت کے لیے ان رسولوں کی مثالیں موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے منحرف ہو کر انسانوں اور شیطانوں
 کی رہنمائی پر چلے اور آخر کار اس قدر ٹکڑے ہو گئے کہ زمین پر ان کا وجود ایک ناقابل برداشت لعنت بن گیا اور خدا کے عذاب نے اگر ان کی



فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ﴿۷﴾

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں، جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے پیغامِ رسائی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا)

نجاست سے دنیا کو پاک کر دیا۔

آخری فقرے سے مقصود دو باتوں پر متنبہ کرنا ہے۔ ایک یہ کہ نفلانی کا وقت گزر جانے کے بعد کسی کا ہوش میں آنا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بے کار ہے۔ سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیانِ حق کی صداؤں کو بہرے کا زوں سے سُننے جائے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں بے شمار مثالیں ہمارے سامنے گزر چکی ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو چکتا ہے اور وہ اپنی مہلت کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک اسے آپکارتی ہے اور ایک مرتبہ پکڑ میں آجانے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل اسے نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران میں ایک دو دفعہ ہمیں سیکڑوں اور ہزاروں مرتبہ یہی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضرور ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے اور ہوش میں آنے کے لیے اسی آخری ساعت کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت و اندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔

۷۔ باز پرس سے مراد ردِ قیامت کی باز پرس ہے۔ بدکار افراد اور قوموں پر دنیا میں جو عذاب آتا ہے وہ دراصل ان کے اعمال کی باز پرس نہیں ہے اور نہ وہ ان کے جرائم کی پوری سزا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تو بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مجرم جو چھوٹا پھر رہا تھا، اچانک گرفتار کر لیا جائے اور مزید ظلم و فساد کے مواقع اس سے چھین لیے جائیں۔ تاریخِ انسانی اس قسم کی گرفتاریوں کی بے شمار نظیروں سے بھری پڑی ہے اور یہ نظیریں اس بات کی ایک صریح علامت ہیں کہ انسان کو دنیا میں شتر بے ہمار کی طرح چھوڑ نہیں دیا گیا ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اوپر کوئی طاقت ہے جو ایک حدِ خاص تک اسے ڈھیل دیتی ہے، تنبیہات پر تنبیہات بھیجتی ہے کہ اپنی شرارتوں سے باز آجائے، اور جب وہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اسے اچانک پکڑ لیتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس تاریخی تجربہ پر غور کرے تو باسانی یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ جو فرمانِ ردا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے اس نے ضرور ایسا ایک وقت مقرر کیا ہو گا جب ان سارے مجرموں پر عدالت قائم ہوگی اور ان سے ان کے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر کی آیت کو جس میں دنیوی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، بعد والی آیت کے ساتھ لفظ ”پس“ کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، گویا اس دنیوی عذاب کا بار بار واقع ہونا آخرت کی باز پرس کے یقیناً واقع ہونے پر ایک دلیل ہے۔

۸۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی باز پرس سراسر رسالتِ ہی کی بنیاد پر ہوگی۔ ایک طرف پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نوعِ انسانی تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا۔ دوسری طرف جن لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچا ان سے سوال کیا جائے گا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک انبیاء کا پیغام نہ پہنچا ہو ان کے بارے

فَلَنَقْصِنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ﴿۷﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ
 بِالْحَقِّ ۚ فَمَنْ تَقَلَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۸﴾ وَ
 مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ بِمَا

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشتان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب
 تو نہیں تھے۔ اور وزن اس روز عین حق ہوگا جن کے پڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے
 اور جن کے پڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری

میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مقدمہ کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ لیکن
 جن اشخاص واقعات تک پیغمبروں کی تسلیم پہنچ چکی ہے ان کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اپنے کفر و انکار اور فسق و نافرمانی کے لیے
 کوئی حجت نہ پیش کر سکیں گے اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ حسرت و ندامت کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے جہنم کی راہ لیں
 ۷ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روز خدا کی میزان عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی ہوں گے۔
 حق کے سوا کوئی چیز و باں وزنی نہ ہوگی اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہوگی جس کے ساتھ جتنا حق ہوگا اتنا ہی وہ با وزن ہوگا۔ اور
 فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا، کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی خواہ دنیا میں کتنی ہی
 طویل و عریض رہی ہو اور کتنے ہی بظاہر شاندار کارنامے اس کی پشت پر ہوں، اس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائے گی۔ باطل
 پرست جب اس میزان میں توڑے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دنیا میں جو کچھ وہ مدت العمر کرتے رہے وہ سب ایک
 پرکاش کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ یہی بات ہے جو سورہ کہف آیات ۱۰۳-۱۰۵ میں فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں سب کچھ
 دنیا ہی کے لیے کرتے رہے اور اللہ کی آیات سے انکار کر کے جن لوگوں نے یہ سمجھے ہوئے کام کی کہ انجام کار کوئی آخرت نہیں ہے اور
 کسی کو حساب دینا نہیں ہے، ان کے کارنامہ زندگی کہ ہم آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے۔

۸ اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ انسان کا کارنامہ زندگی دو پہلوؤں میں تقسیم ہوگا۔ ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی
 پہلو۔ مثبت پہلو میں صرف حق کو جاننا اور ماننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہوگا اور آخرت میں اگر کوئی چیز
 وزنی اور قیمتی ہوگی تو وہ بس یہی ہوگی۔ بخلاف اس کے حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہش نفس
 یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے غیر حق کی راہ میں کرتا ہے وہ سب منفی پہلو میں جگہ پائے گا اور صرف
 یہی نہیں کہ یہ منفی پہلو بجائے خود بے قدر ہوگا بلکہ یہ آدمی کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دے گا۔

پس آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے کارنامہ زندگی کا مثبت پہلو اس کے

كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾ وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا
لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا ۗ مَا تَشْكُرُونَ ﴿١٠﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ
ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ۖ

آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارا لیے یہاں سامانِ زیست فراہم
کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہوئے

ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو

منفی پہلو پر غالب ہو اور نقصانات میں بہت کچھ سے دلا کر بھی اس کے حساب میں کچھ نہ کچھ بچا رہ جائے۔ رہا وہ شخص جس کی زندگی
کا منفی پہلو اس کے تمام مثبت پہلوؤں کو دبا لے تو اس کا حال بالکل اُس دیوالیہ تاجر کا سا ہوگا جس کی ساری پونجی خساروں
کا بھگتان بھگتنے اور مطالبات ادا کرنے ہی میں کھپ جائے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ مطالبات اس کے ذمہ باقی رہ جائیں۔

۱۰۔ تعاقب کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ - آیات ۳۰ تا ۳۹۔

سورۃ بقرہ میں حکمِ سجدہ کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان سے شبہ ہو سکتا تھا کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم صرف آدم
علیہ السلام کی شخصیت کے لیے دیا گیا تھا۔ مگر یہاں وہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔ یہاں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے صاف
معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدم ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کا نمائندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔
اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، اس کا مطلب
یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادہ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک
زندہ ہستی کی حیثیت سے انسان وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید
میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۃ ص میں ہے: اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ اِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ
طِينٍ ۗ فَاِذَا اسْتَوَيْتَهُ وَاَنْفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ ۗ (آیات ۷۱-۷۲) "نقص کر داس وقت کا جب
کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پریمی طرح تیار کروں اور اس
کے اندر اپنی روح سے کچھ چھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔" اس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے
انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء
اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ چھونک کر آدم کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۃ بقرہ

میں بایں الفاظ لایا گیا ہے، وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَبِّ
 هَسْتُونَ، فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَجِدًا (۲۸-۲۹) اور تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے
 رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار
 کروں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔
 تخلیق انسانی کے اس آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری
 طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ مرادِ ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا، پھر اس کی صورت گری اور تبدیل کیسے ہوئی، اور اس کے اندر روح
 پھونکنے کی نوعیت کیا تھی۔ لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف
 بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں ڈارون کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی
 اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا، مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کے طویل خط میں
 کوئی نقطہ خاص ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر ”نوع انسان“ کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف
 اس کے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے، اُس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً
 کوئی رشتہ نہیں رکھتی، وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدانے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی
 زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطہ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصور پیدا
 ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجیے تو آپ کو انسان اصل حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین، حتیٰ کہ
 اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اُس کے لیے
 حیوانات کا سا طرز عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرز عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرز عمل اور حیوانی طرز عمل میں
 آپ دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے
 بغیر کرتے ہیں انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو
 جانور کے بجائے ”انسان“ ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ ”حیوانِ ناطق“ یا ”متمدن جانور“

نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اُسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اس کا
 نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدانے اس کے سپرد کیا ہے
 اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ تعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویہ نظر سے یکساں
 مختلف ہو جائے گی آپ انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفہ حیات اور ایک دوسرا ہی نظام اخلاق و تمدن و قانون طلب
 کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود خود عالمِ اسفل کے بجائے
 عالمِ بالا کی طرف اٹھنے لگے گی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ دوسرا تصور انسان چاہے اخلاقی اور نفسیاتی حیثیت سے کتنا ہی بلند ہو مگر محض اس تکمیل

فَسَجِدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝۱۱ قَالَ مَا مَنَعَكَ
 إِلَّا تَسْبُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ
 وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝۱۲ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ
 أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝۱۳

اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔

پوچھا، ”تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟“

بولاً، ”میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے۔“

فرمایا، ”اچھا، تو یہاں سے نیچے اتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھنڈ کرے۔ نکل جا

کہ درحقیقت تو اُن لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔“

کی خاطر ایک ایسے نظریہ کو کس طرح رد کر دیا جائے جو سائنٹفک دلائل سے ثابت ہے۔ لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ڈاروینی نظریہ ارتقاء سائنٹفک دلائل سے ثابت ہو چکا ہے؟ سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط منہی میں ہیں کہ یہ نظریہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے، لیکن متفقین اس بات کو جانتے ہیں کہ الفاظ اور ہڈیوں کے لمبے چوڑے سرو سامان کے باوجود ابھی تک یہ صرف ایک نظریہ ہی ہے اور اس کے جن دلائل کو غلطی سے دلائل ثبوت کہا جاتا ہے وہ دراصل محض دلائل امکان ہیں، یعنی ان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ڈاروینی ارتقاء کا ویسا ہی امکان ہے جیسا براہ راست عمل تخلیق سے ایک ایک نوع کے الگ الگ وجود میں آنے کا امکان ہے۔

اللہ اصل میں لفظ صاعن بن استعمال ہوا ہے۔ صاعن کے معنی ہیں الواضی بالذلل، یعنی وہ جو ذلت

اور صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا اپنی

بڑائی کے گھنڈ میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتال کرنا کہ اپنی عزت و برتری کا جو تصور تو نے خود قائم کر لیا

ہے اس کے لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجب توہین نظر آتا ہے، یہ دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ تو خود اپنی ذلت چاہتا

ہے۔ بڑائی کا جھوٹا پندار، عزت کا بے بنیاد ادعا اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر

فائز سمجھ بیٹھنا، تجھے بڑا اور ذی عزت اور بزرگ نہیں بنا سکتا بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل اور پست ہی بناٹے گا اور اپنی اس ذلت

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۳﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۱۴﴾
 قَالَ فِيمَا أُغْوِيْتَنِي لِأَفْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱۵﴾
 ثُمَّ لَا تِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
 أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿۱۶﴾

بولاً، ”مجھے اُس دن تک مُہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔“
 فرمایا، ”تجھے مُہلت ہے۔“

بولاً، ”اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر
 ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو
 گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔“

دُخاری کا سبب تو آپ ہی ہوگا۔

۱۳۔ یہ وہ چیلنج تھا جو ابلیس نے خدا کو دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مُہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک
 کے لیے دی ہے اس سے فائدہ اُٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دوں گا کہ انسان اُس نفسیت کا مستحق نہیں
 ہے جو آپ نے میرے مقابلہ میں اسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ کیسا ناشکر، کیسا نیک حرام اور کیسا احسان
 فراموش ہے۔

یہ مُہلت جو شیطان نے مانگی اور خدا نے اسے عطا فرمادی، اس سے مراد محض وقت ہی نہیں ہے بلکہ اُس کام کا
 موقع دینا بھی ہے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے انسان کو بہکانے اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اس
 کی تاہلی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے، اور یہ موقع اللہ تعالیٰ نے اسے دے دیا چنانچہ سورہ نبی السراہیل آیات ۶۱-۶۵ میں
 اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اختیار دے دیا کہ آدم اور اس کی اولاد کو راہِ راست سے ہٹا دینے کے لیے جو چاہیں وہ
 چلنا چاہتا ہے، چلے۔ ان چال بازیوں سے اسے روکا نہیں جائے گا بلکہ وہ سب راہیں کھلی رہیں گی جن سے وہ انسان کو فتنہ
 میں ڈالنا چاہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگادی کہ اِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ، یعنی میرے
 بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا۔ تو صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط نمیبوں میں ڈالے، جھوٹی امیدیں دلائے، بدی اور
 گمراہی کو ان کے سامنے خوش نمابنا کر پیش کرے، لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر ان کو غلط راستوں کی طرف دعوت دے۔

قَالَ اخْرِجْ مِنْهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمَلْنَا
 بَهِتَمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ۱۸ وَيَا دَا مَرْاسِكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
 فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ
 الظَّالِمِينَ ۱۹ فَوَسَّوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ
 عَنْهُمَا مِنْ سَوَاتِمِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ

فرمایا، ”نکل جا یہاں سے ویس اور ٹھکرایا ہوا یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی
 کریں گے، تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اور اسے آدم، تو اور تیری بیوی دونوں اس
 جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ
 ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔“

پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی ٹھمرگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے
 سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا ”تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی

مگر یہ طاقت تجھے نہیں دی جائے گی کہ انہیں ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے راستے پر پہنچانے جاٹے اور اگر وہ خود راہ راست پر چلنا چاہیں
 تو انہیں نہ چلنے دے۔ یہی بات سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں عدالت الہی سے فیصلہ صادر ہو جانے
 کے بعد شیطان اپنے پیروانوں سے کہے گا وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ
 لِي فَلَا تَلُمُونِي وَلَا تَلُمُوا أَنْفُسَكُمْ، یعنی میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں کہ میں نے اپنی پیروی پر تمہیں مجبور کیا ہوا میں نے
 اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنی راہ پر بلایا اور تم نے میری دعوت قبول کر لی۔ لہذا اب مجھے ملامت نہ کر دیکر اپنے آپ کو ملامت کرو۔
 اور یہ جو شیطان نے خدا پر الزام عائد کیا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی
 مصیبت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے۔ اس کو شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنے میں ڈالا اور
 میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا کہ میں نے تیری نافرمانی کی۔ گویا اس جنت کی خواہش یہ تھی کہ
 اس کے نفس کی چوری چوری نہ جاتی بلکہ جس پندار غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا
 رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرے
 سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۝۲۰ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي
لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۝۲۱ فَذَلَّهُمَا بِغُرُوبٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ
بَدَتُ لَهُمَا سَوَاتِمُهُمَا وَطَفِقَا لِيَخِصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وُرْقِ الْجَنَّةِ
وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنِ تِلْكَ الشَّجَرَةِ وَأَقُلْتُ لَكُمَا
إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝۲۲ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا
وَرَأَيْنَا لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝۲۳

وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔

اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انہوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو حیرت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔

تب ان کے رب نے انہیں پکارا ”کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟“

دونوں بول اٹھے ”اے رب، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔“

۳۱ اس قصے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کا ارتقا سے معنوی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ کتابی چیز ہے جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے بلکہ حقیقت

یہ وہ فطری چیز ہے جو اقل روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہ تھی کہ اُس کے اس جذبہ شرم و حیا پر ضرب لگائے اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو جنسی معاملات میں بدرہہ کر دے۔ بالفاظِ دیگر اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملہ کے لیے تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا جنسی پہلو تھا اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اُس محافظِ فصیل پر لگائی جو شرم و حیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ شیاطین اور ان کے شاگردوں کی یہ روش آج تک جوں کی توں قائم ہے۔ "ترقی" کا کوئی کام ان کے ہاں شروع نہیں ہو سکتا جب تک کہ عورت کو بے پردہ کر کے وہ بازار میں نہ لاکھڑا کریں اور اُسے کسی نہ کسی طرح عریاں نہ کر دیں۔

(۳) یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اُسے جال میں بھانسنے کے لیے ہر داعیِ شر کو خیر خواہ کے بھیس ہی میں آنا پڑتا ہے۔

(۴) انسان کے اندر معالیٰ امور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیاتِ جادواں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اُسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعہ سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے اپیل کیا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے اور پھر اُس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اُسے الٹا پستی کی طرف لے جائے۔

(۵) عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انہیں حضرت آدمؑ کو بھانسنے کے لیے آٹھ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوا کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں۔

(۶) یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ شجر ممنوعہ کا مزہ چکھتے ہی آدم و حوا کے ستر کھل جانا، اُس درخت کی کسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا ستر اپنے انتظام سے ڈھانکا تھا۔ جب انہوں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت اُن سے ہٹائی گئی، اُن کا پردہ کھول دیا گیا اور انہیں خود اُن کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا گیا کہ اپنی پردہ پریشی کا انتظام خود کریں اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سعی نہ کریں تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں۔ یہ گویا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ انسان جب خدا کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سیر اس کا پردہ کھل کر رہے گا۔ اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید و حمایت اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیع فرمان رہے گا۔ طاعت کے حدود سے قدم باہر نکالنے کے بعد اسے خدا کی تائید ہرگز حاصل نہ ہوگی بلکہ اسے خود اس کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اور اسی کے متعلق حضورؐ نے دعا فرمائی ہے کہ اللھم! رحمتک ارجو! فلا تکلفی الی نفسی

طرفہ عین (خدا یا میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں پس مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر)۔

(۷) شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو اس کے مقابلہ میں انسان کو دی گئی

ہے۔ لیکن پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان اپنے رب کے امر کی فرمانبرداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی یہ کمزوری ظاہر ہو گئی کہ وہ اپنے حریف کے فریب میں آکر اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے۔ مگر بہر حال اس ادین مقابلہ میں قطعی ثابت ہو گیا کہ انسان اپنے اخلاقی مرتبہ میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا، اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا پر اللہ کے امر کی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شیطان کے بہکانے سے وہ اس میں مبتلا ہوا۔ ثالثاً انسان نے شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ داعی شر کو داعی خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا۔ وہ پستی کی طرف پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ یہ راستہ اُسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔ رابعاً شیطان کو تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے تصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف پلٹ آنے کے بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے تصور پر متنبہ کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ تادم ہوا، اپنے تصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

(۸) اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے بالکل متمیز ہو گئیں۔

خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے، خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرے، متنبہ کیے جانے کے باوجود پورے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرز عمل پر اصرار کیے چلا جائے اور جو لوگ طاعت کی راہ چل رہے ہوں ان کو بھی بہکائے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اول تو وہ شیطانی اغوا کی مزاحمت کرے اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و طاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس تصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہو گیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین یہ کرنا مقصود ہے کہ جس راہ پر تم لوگ جا رہے ہو یہ شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمہارا خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطین جن وانس کو اپنا ولی و سرپرست بنانا، اور یہ تمہارا پے درپے تنبیہات کے باوجود اپنی غلطی پر اصرار کیے چلے جانا، یہ دراصل خالص شیطانی رویہ ہے۔ تم اپنے ازلی دشمن کے دام میں گرفتار ہو گئے ہو اور اس سے مکمل شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام پھر وہی ہے جس سے شیطان خود دوچار ہونے والا ہے۔ اگر تم حقیقت میں خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو اور کچھ بھی ہوش تم میں باقی ہے تو سنبھلو اور وہ راہ اختیار کرو جو آخر کار تمہارے باپ اور تمہاری ماں آدم و حوا نے اختیار کی تھی۔

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ
إِلَىٰ حِينٍ ﴿۲۳﴾ قَالَ فِيهَا تَحْبُونَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ
يَبْنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِسُ سَوَاتِكُمْ وَرَأَيْتُمُ

فرمایا، "اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک
زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زینت ہے۔" اور فرمایا "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے
اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا۔" ع

اسے اولاد آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے

۱۲۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو جنت سے اُتر جانے کا یہ حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا
قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تفسیر کی گئی ہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انہیں معاف کر دیا۔ لہذا اس حکم میں
سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہ اُس منشاء کی تکمیل ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔ (تفسیر ص ۵۳) کے لیے ملاحظہ ہو
سورہ بقرہ، حاشیہ ۱۲ و ۱۳۔

۱۵۔ اب قصہ آدم و حوا کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ منقطع کر کے اہل عرب کے سامنے خود ان کی اپنی زندگی
کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دہی فرمائی جاتی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم
کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابل شرم حصوں کی پردہ پوشی اُن کے
نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انہیں اپنے ستر و سردوں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظر عام پر نہ لینا،
راہ چلتے قہنائے حاجت کے لیے میٹھ جانا، ازار کھل جانے کو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا اُن کے شب و روز کے معمولات
تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی
عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا
ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی، دنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک
ہیں اس لیے خطاب اہل عرب کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے، اور سارے بنی آدم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی
اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود ہے۔ تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اُس کے رسولوں کی
دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اس نے تمہیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اسی بے حیائی میں
مبتلا کر دیا جس میں وہ تمہارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے کہ رسولوں کی

وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَكَّرُونَ ﴿۲۶﴾ يَبْنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكَ الشَّيْطَانُ كَمَا
أَخْرَجَ أَبَوَيْكَ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا
سَوَاتِيَهُمَا إِنَّهُ يَزُكُّكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ
إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطَانَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۲۷﴾

اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ
اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم، ایسا نہ ہو کہ شیطان
تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوا یا تھا اور
ان کے لباس ان پر سے اتروا دیے تھے تاکہ ان کی نثر مگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ او
اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو
ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

۱۶ ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں:

اول یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے
انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدا نہیں کی گئی اور نہ ہی بلکہ حیا اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں درجیت کر
دیا۔ اس نے انسان کے لیے اس کے اعضاء و صنفی کو محض اعضاء صنفی ہی نہیں بنایا بلکہ سوائے ان کے بھی بنایا جس کے
معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے
اس نے کوئی بنا بنایا لباس انسان کو نہیں دے دیا بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا رَاٰنَزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا
تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس
فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رو سے انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سواۃ کو ڈھانکے۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آيَاتِنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِهَآءِ قُلْ إِنْ لَمْ يَأْمُرِ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا

یہ لوگ جب کوئی نثر مناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو اللہ بچیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ

اور اس کی طبعی ضرورت تو خراب ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے سہولت جسم کی آرائش اور کوسمی اثرات سے بدن کی حفاظت کا ذریعہ ہو۔ اس باب میں بھی فطرۃ انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ ان کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا "ریش" ہونا ہے، رہا اس کا ستر پوش ہونا تو ان کے اعضاء صنفی سرے سے سواۃ ہی نہیں ہیں کہ انہیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جبلت میں کوئی داعیہ موجود ہوتا اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جاتا۔ لیکن جب انسانوں نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر اٹل گیا۔ اس نے اپنے ان شاگردوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمہارے لیے لباس کی ضرورت بعینہ وہی ہے جو حیوانات کے لیے ریش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سواۃ کو چھپانے والی چیز ہونا، تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضاء سواۃ نہیں ہیں اسی طرح تمہارے یہ اعضاء بھی سواۃ نہیں، محض اعضاء صنفی ہی ہیں۔

تو یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعہ ستر پوشی اور وسیلہ زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ حقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ستر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے برا ہو، اور فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر ان ذہنی امرہن کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنا ناپن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں، اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملہ میں اس خیر مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح ان لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سر پرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غلطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہاں ہم یہ کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں چاروں طرف پھیل ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اُدھر جن حقائق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے انہیں اگر تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات باسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿۲۹﴾

بائیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے (وہ اللہ کی طرف سے ہیں) اے محمدؐ، ان سے کہو میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر جس طرح اُس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔

۲۸ اشارہ ہے اہل عرب کے برہنہ طواف کی طرف، جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ وہ لوگ اس کو ایک مذہبی فعل سمجھ کر کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ خدا نے یہ حکم دیا ہے۔

۲۹ بظاہر یہ ایک بہت ہی مختصر سا جملہ ہے مگر درحقیقت اس میں قرآن مجید نے ان لوگوں کے جاہلانہ عقائد کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل پیش کی ہے۔ اس طرز استدلال کو سمجھنے کے لیے دو باتیں بطور مقدمہ کے پہلے سمجھ لینی چاہئیں: ایک یہ کہ اہل عرب اگرچہ اپنی بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے، لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرمناک فعل ہونا خود ان کے نزدیک بھی مسلم تھا، چنانچہ کوئی شریف اور ذی عزت عرب اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ کسی مذہب مجلس میں، یا بازار میں یا اپنے اعزہ اور اقربا کے درمیان برہنہ ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ برہنگی کو شرمناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقع پر اختیار کرتے تھے اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے اس پر قرآن مجید یہ استدلال کرتا ہے کہ جو کام فحش ہے اور جسے تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ فحش ہے اس کے متعلق تم یہ کیسے باور کر لیتے ہو کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہو گا کسی فحش کام کا حکم خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتا اور اگر تمہارے مذہب میں ایسا حکم پایا جاتا ہے تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ تمہارا مذہب خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

۱۹ مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو تمہاری ان بیہودہ رسموں سے کیا تعلق۔ اُس نے جس دین کی تعلیم دی ہے اس کے بنیادی اصول تو یہ ہیں کہ:

(۱) انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے،

(۲) عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھے، یعنی خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک اس کی عبادت میں نہ ہو، ممبر و حقیقی

کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت و غلامی اور عجز و نیاز کا رخ ذرا نہ پھرنے پائے،

(۳) رہنمائی اور تائید و نصرت اور نگہبانی و حفاظت کے لیے خدا ہی سے دعا مانگے، مگر شرط یہ ہے کہ اس چیز کی دعا

مانگنے والا آدمی پہلے اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کر چکا ہو۔ یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور بندگی

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا
 الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾
 يَبْنِي أَدَمَ خُدُوعًا وَزِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا
 وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾

ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے
 کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ
 ہم سیدھی راہ پر ہیں۔

اسے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے
 تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اغیار پر چلایا جا رہا ہو اور مدد خدا سے مانگی جائے کہ اسے خدا، یہ بنیاد جو ہم تجھ سے کر رہے ہیں اس میں ہماری مدد فرما۔

(۴) اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہوا ہے اسی طرح ایک دوسرے عالم میں بھی اس کو پیدا
 کیا جائے گا اور اسے اپنے اعمال کا حساب خدا کو دینا ہوگا۔

۳۰ یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑے ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ
 آدمی محض اپنا ستر چھپالے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حسب استطاعت وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں ستر پوشی بھی
 ہو اور زینت بھی۔ یہ حکم اس غلط رویہ کی تردید کے لیے ہے جس پر جہلا اپنی عبادتوں میں عمل کرنے رہے ہیں اور آج تک کہتے
 ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ برہنہ یا نیم برہنہ ہو کر اور اپنی ہیئتوں کو بگاڑ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس خدا کہتا ہے
 کہ اپنی زینت سے آراستہ ہو کر ایسی وضع میں عبادت کرنی چاہیے جس کے اندر برہنگی تو کیا، ناٹائستگی کا بھی شائبہ
 تک نہ ہو۔

۳۱ یعنی خدا کو تمہاری خستہ حالی اور فاقہ کشی اور طبیعت رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجالانے کے
 لیے یہ کسی درجہ میں بھی مطلوب ہو۔ بلکہ اس کی عین خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بخشے ہوئے عمدہ لباس پہنو اور پاک رزق سے
 مستمتع ہو۔ اس کی شریعت میں اصل گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے، خواہ یہ تجاوز حلال کو

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ
 مِنَ الرِّزْقِ ۗ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
 خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ
 لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ سَرِيَّ الْفَوَاحِشِ

اے محمدؐ، ان سے کہو کہ جس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بھٹی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے محمدؐ، ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرعی کے

حرام کر لینے کی شکل میں ہو یا حرام کو حلال کر لینے کی شکل میں۔

۳۲ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے اللہ کا منشاء تو بہر حال یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی نظام اخلاق و معاشرت ایسا ہے جو انہیں حرام یا ناقابلِ نفرت، یا ارتقاٹے روحانی میں سدا راہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ بھی ان جنتوں میں سے ایک اہم حجت ہے جو قرآن نے مذاہب باطلہ کے رد میں پیش کی ہیں، اور اس کو سمجھ لینا قرآن کے طرز استدلال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

۳۳ یعنی حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان ہی کے لیے ہیں، کیونکہ وہی خدا کی دفا دار رعایا ہیں اور حق نمک صرف نمک حلالوں ہی کو پہنچتا ہے۔ لیکن دنیا کا موجودہ انتظام چونکہ آزمائش اور مہلت کے اصول پر قائم کیا گیا ہے، اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں نمک حراموں پر بھی تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور بسا اوقات نمک حلالوں سے بڑھ کر انہیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں جہاں کا سارا انتظام خالص حق کی بنیاد پر ہو گا، زندگی کی آرائشیں اور رزق کے طہیات سب کے سب محض نمک حلالوں کے لیے مخصوص ہوں گے اور وہ نمک حرام ان میں سے کچھ نہ پاسکیں گے جنہوں نے اپنے رب کے رزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾ وَلكلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۴﴾

کام — خواہ کھلے ہوں یا چھپے — اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کر جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔

ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔ (اور یہ بات اللہ نے آغاز تخلیق ہی میں صاف فرمادی تھی کہ)

۳۳ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ انعام، حواشی ۱۲۸ و ۱۳۱۔

۳۴ اصل میں لفظ اِثْمٌ استعمال ہوا ہے جس کے اصل معنی کڑاہی کے ہیں۔ اِثْمٌ اُس اور لُغْنٌ کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو مگر جان بوجھ کر سست چلے۔ اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہوا ہے، یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت و فرماں برداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں جان بوجھ کر قصور دکھانا۔

۳۵ یعنی اپنی حد سے تجاوز کر کے ایسے حدود میں قدم رکھنا جن کے اندر داخل ہونے کا آدمی کو حق نہ ہو۔ اس تعریف کی رو سے وہ لوگ بھی باغی قرار پاتے ہیں جو بندگی کی حد سے نکل کر خدا کے ملک میں خود مختارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور وہ بھی جو خدا کی خدائی میں اپنی کبریائی کے ٹونکے بجاتے ہیں اور وہ بھی جو بندگان خدا کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں۔

۳۶ مہلت کی مدت مقرر کیے جانے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہر قوم کے لیے برسوں اور مہینوں اور دنوں کے لحاظ سے ایک عمر مقرر کی جاتی ہو اور اس عمر کے تمام ہوتے ہی اس قوم کو لازماً ختم کر دیا جاتا ہو۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم کو دنیا میں کام کرنے کا جو موقع دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے، بایں معنی کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم کتنا تناسب برداشت کیا جاسکتا ہے۔ جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلہ میں تناسب کی اُس آخری حد سے فرور رہتی ہیں اس وقت تک اُسے اس کی تمام برائیوں کے باوجود مہلت دی جاتی رہتی ہے اور جب وہ اس حد

لِبَنِي آدَمَ مَا يَآتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۖ
 فَمِنَ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۵﴾
 وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ
 كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۖ أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمُ نَصِيبُهُم مِّنَ
 الْكِتَابِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَقَّوْنَهُمْ قَالُوا آيُنَا

اسے بنی آدم، یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات
 سنائے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کر لے گا اس کے لیے کسی خوف
 اور سزا کا موقع نہیں ہے، اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی
 برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اُس سے بڑا ظالم اور کون
 ہوگا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائے ایسے
 لوگ اپنے نوشتہ تقدیر کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے گی جب ہمارے بھی
 ہوئے فرشتے ان کی رُو جس قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے۔ اُس وقت وہ ان سے پوچھیں گے کہ بتاؤ کہاں ہیں

سے گزر جاتی ہیں تو پھر اس بدکار و بدصفات قوم کو مزید کوئی مہلت نہیں دی جاتی، اس بات کو سمجھنے کے لیے سورہ نوح آیات ۲۴-۱-۱۲ نگاہ میں
 آئے۔ یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم و حوا علیہما السلام کے جنت سے
 اتارے جانے کا ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیات ۳۸-۳۹-۴۰، آیات ۱۲۳-۱۲۴) لہذا یہاں بھی اس کو اسی
 موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوع انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اسی وقت یہ بات صاف طور پر سبھادی گئی تھی
 (ملاحظہ ہو سورہ آل عمران حاشیہ ۶۹)

۳۹ یعنی دنیا میں جتنے دن ان کی مہلت کے مقرر ہیں یہاں رہیں گے اور جس قسم کی بظاہر اچھی یا بُری زندگی گزارنا
 ان کے نصیب میں ہے گزار لیں گے۔

مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا
 عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ
 خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا
 دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا دَارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا
 قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأَوْلَاهُمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَاتِهِمْ عَذَابًا
 ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٍ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾

تمہارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے، وہ کہیں گے کہ سب ہم سے
 گم ہو گئے۔ اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکر حق تھے۔ اللہ فرمائے گا
 جاؤ، تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن وانس جا چکے
 ہیں۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا
 حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ
 اے رب، یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا لہذا انہیں آگ کا دوسرا عذاب دے۔
 جواب میں ارشاد ہوگا، ہر ایک کے لیے دوسرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔

۳۷ یعنی بہر حال تم میں سے ہر گروہ کسی کا خلف تھا تو کسی کا سلف بھی تھا۔ اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اس کے
 لیے نیکو عمل کی گمراہیوں کا ورثہ چھوڑا تھا تو خود وہ بھی اپنے اخلاف کے لیے ویسا ہی ورثہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا۔
 اگر ایک گروہ کے گمراہ ہونے کی کچھ ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اخلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا
 بار خود اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ہر ایک کے لیے دوسرا عذاب ہے۔ ایک عذاب خود گمراہی اختیار
 کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کے لیے جرائم پیشگی
 کی میراث چھوڑ آنے کی۔

حدیث میں اسی مضمون کی توضیح یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ من ابتداء بدعة ضلالة لا یرضاہا اللہ

درسولہ کان علیہ من الاثم مثل اثم من عمل بہا لا ینقص ذلک من اوزارہم شیئاً یعنی جس نے کسی نئی گمراہی کا آغاز کیا جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، تو اس پر ان سب لوگوں کے گناہ کی ذمہ داری عائد ہوگی جنہوں نے اس کے نکالے ہوئے طریقہ پر عمل کیا بغیر اس کے کہ خود ان عمل کرنے والوں کی ذمہ داری میں کوئی کمی ہو۔ دوسری حدیث میں ہے لا تقتل نفس ظلماً الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمہ لانہ اول من سن القتل یعنی دنیا میں جو انسان بھی ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے اس کے خونِ ناحق کا ایک حصہ آدم کے اس پہلے بیٹے کو پہنچتا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، کیونکہ قتل انسان کا راستہ سب سے پہلے اسی نے کھولا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رویہ کی بنا ڈالتا ہے وہ صرف اپنی ہی غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں ان سب کے گناہ کی ذمہ داری کا بھی ایک حصہ اس کے حساب میں لکھا جاتا رہتا ہے اور جب تک اس کی اس غلطی کے اثرات چلتے رہتے ہیں اس کے حساب میں ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کا صرف اپنی ذات کی حد تک ہی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی جواب وہ ہے کہ اس کی نیکی یا بدی کے کیا اثرات دوسروں کی زندگیوں پر مرتب ہوئے۔

مثال کے طور پر ایک زانی کو بھیجیے۔ جن لوگوں کی تعلیم و تربیت سے، جن کی صحبت کے اثر سے، جن کی بُری مثالیں دیکھنے سے، اور جن کی ترغیبات سے اس شخص کے اندر زنا کاری کی صفت نے ظہور کیا وہ سب اس کے زنا کار بننے میں حصہ دار ہیں۔ اور خود ان لوگوں نے اوپر جہاں جہاں سے اس بد نظری و بدینتی اور بد کاری کی میراث پائی ہے وہاں تک اس کی ذمہ داری پہنچتی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ اس اولین انسان پر منتهی ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے نوع انسانی کو خواہش نفس کی تسکین کا یہ غلط راستہ دکھایا۔ یہ اس زانی کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کے ہم عصروں اور اس کے اسلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر وہ خود بھی اپنی زنا کاری کا ذمہ دار ہے۔ اُس کو بھلے اور بُرے کی جو تمیز دی گئی تھی، اس میں ضمیر کی جو طاقت رکھی گئی تھی، اس کے اندر ضبطِ نفس کی جو قوت و رعیت کی گئی تھی، اس کو نیک لوگوں سے خیر و شر کا جو علم پہنچا تھا، اس کے سامنے اختیار کی جو مثالیں موجود تھیں، اس کو صنفی بد عملی کے برے نتائج سے جو واقفیت تھی، ان میں سے کسی چیز سے بھی اس نے فائدہ نہ اٹھایا اور اپنے آپ کو نفس کی اُس اندھی خواہش کے حوالے کر دیا جو صرف اپنی تسکین چاہتی تھی خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ یہ اس کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر یہ شخص اُس بدی کو جس کا اکتساب اس نے کیا اور جسے خود اپنی سعی سے وہ پرورش کرتا رہا، دوسروں میں پھیلانا شروع کرتا ہے۔ کسی مرضِ خبیث کی چھت کہیں سے نکالتا ہے اور اسے اپنی نسل میں اور خدا جانے کن کن نسلوں میں پھیلا کر نہ معلوم کتنی زندگیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنا نطفہ چھوڑتا ہے اور جس بچہ کی پرورش کا بار اسے خود اٹھانا چاہیے تھا اسے کسی اور کی کمائی کا ناجائز حصہ دار، اس کے بچوں کے حقوق میں زبردستی کا شریک، اس کی میراث میں ناحق کا حق دار بنا دیتا ہے اور اس حق تلفی کا سلسلہ نہ معلوم کتنی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ کسی دوشیزہ لڑکی کو پھسلا کر بد اخلاقی کی راہ پر ڈالتا ہے اور اس کے اندر وہ بُری صفات ابھار دیتا ہے جو اس سے منعکس ہو کر نہ معلوم کتنے خاندانوں اور کتنی نسلوں تک پہنچتی ہیں اور کتنے گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ اپنی اولاد اپنے اقارب، اپنے دوستوں اور اپنی سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے سامنے اپنے اخلاق

کی ایک بُری مثال پیش کرتا ہے اور نہ معلوم کتنے آدمیوں کے چال چلن خراب کرنے کا سبب بن جاتا ہے جس کے اثرات بعد کی نسلوں میں مدتہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں۔ یہ سارا فساد جو اس شخص نے سوسائٹی میں برپا کیا، انصاف چاہتا ہے کہ یہ بھی اس کے حساب میں لکھا جائے اور اس وقت تک لکھا جاتا رہے جب تک اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہے۔

اسی پر نیکی کو بھی قیاس کر لینا چاہیے۔ جو نیک درختہ اپنے اسلاف سے ہم کو بلا ہے اُس کا اجر اُن سب لوگوں کو پہنچنا چاہیے جو ابتداءے آفرینش سے ہمارے زمانہ تک اُس کے منتقل کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں پھر اس درختہ کو سے کر اسے سنبھالنے اور ترقی دینے میں جو خدمت ہم انجام دیں گے اس کا اجر ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ پھر اپنی سچی خیر کے جو نقوش و اثرات ہم دنیا میں چھوڑ جائیں گے انہیں بھی ہماری بھلائیوں کے حساب میں اس وقت تک برابر درج ہوتے رہنا چاہیے جب تک یہ نقوش باقی رہیں اور ان کے اثرات کا سلسلہ نوری انسانی میں چلتا رہے اور ان کے فوائد سے خلقِ خدا متمتع ہوتی رہے۔ جزا کی یہ صورت جو قرآن پیش کر رہا ہے، ہر صاحبِ عقل انسان تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس سے اُن لوگوں کی غلط نمبیاں بھی دودھ ہو سکتی ہیں جنہوں نے جزاء کے لیے اسی دنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھ لیا ہے، اور اُن لوگوں کی غلط نمبیاں بھی جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزاء تناسخ کی صورت میں مل سکتی ہے۔ دراصل ان دونوں گروہوں نے نہ تو انسانی اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی دستوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔ ایک انسان آج اپنی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں جو اچھے یا بُرے کام کرتا ہے ان کی ذمہ داری میں نہ معلوم اوپر کی کتنی نسلیں شریک ہیں جو گزر چکیں اور آج یہ ممکن نہیں کہ انہیں اس کی جزاء یا سزا پہنچ سکے۔ پھر اس شخص کے یہ اچھے یا بُرے اعمال جو وہ آج کر رہا ہے اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ ان کے اثرات کا سلسلہ آئندہ صد ہا برس تک چلتا رہے گا، ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک پھیلے گا اور اس کے حساب کا کھاتا اس وقت تک کھلا رہے گا جب تک یہ اثرات چل رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ آج ہی اس دنیا کی زندگی میں اس شخص کو اس کے کسب کی پوری جزا مل جائے درآں حالے کہ ابھی اس کے کسب کے اثرات کا لاکھوں حصہ بھی رونما نہیں ہوا ہے۔ پھر اس دنیا کی محدود زندگی اور اس کے محدود امکانات سرے سے اتنی گنجائش ہی نہیں رکھتے کہ یہاں کسی کو اس کے کسب کا پورا بدلہ مل سکے۔ آپ کسی ایسے شخص کے جرم کا تصور کیجیے جو مثلاً دنیا میں ایک جنگِ عظیم کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس کی اس حرکت کے بے شمار برے نتائج ہزاروں برس تک ہزاروں انسانوں تک پھیلتے ہیں۔ کیا کوئی بڑی سے بڑی جسمانی، اخلاقی، روحانی، یا مادی سزا بھی، جو اس دنیا میں دی جانی ممکن ہے، اُس کے اس جرم کی پوری منصفانہ سزا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کیا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انعام بھی، جس کا تصور آپ کر سکتے ہیں، کسی ایسے شخص کے لیے کافی ہو سکتا ہے جو مدتہائے نوری انسانی کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہا ہو اور ہزاروں سال تک بے شمار انسان جس کی سسی کے ثمرات سے فائدہ اٹھائے چلے جا رہے ہوں۔ عمل اور جزا کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص دیکھے گا اُسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کے لیے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے جہاں تمام اگلی اور پھلی نسلیں جمع ہوں، تمام انسانوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں، حساب کرنے کے لیے ایک

وَقَالَتْ أُولَهُمْ لِأَخْرَبَهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ
فَضْلٍ فذوقوا العذاب بما كنتم تكسبون ﴿۳۹﴾

اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابل الزام تھے) تو تمہاری کوہم پر کونسی فضیلت
حاصل تھی، اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔ ع

عظیم و خیر خدا انصاف کی کرسی پر متمکن ہو، اور اعمال کا پورا بدلہ پانے کے لیے انسان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گرد و
پیش جزا و سزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔

پھر اسی پہلو پر غور کرنے سے اہل تماشیح کی ایک اور بنیادی غلطی کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے جس میں مبتلا ہو کر انہوں نے
آواگون کا پکر تجویز کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ صرف ایک ہی مختصر سی پچاس سالہ زندگی کے کارنامے کا پھل پانے
کے لیے اُس سے ہزاروں گنی زیادہ طویل زندگی درکار ہے، کجا کہ اس پچاس سالہ زندگی کے ختم ہوتے ہی ہماری ایک دوسری
اور پھر تیسری ذمہ دارانہ زندگی اسی دنیا میں شروع ہو جائے اور ان زندگیوں میں بھی ہم مزید ایسے کام کرتے چلے جائیں جن کا
اچھایا برا پھل ہمیں ملنا ضروری ہو۔ اس طرح تو حساب بے باقی ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھنا ہی چلا جائے گا اور اس کے
بے باقی ہونے کی نوبت کبھی آہی نہ سکے گی۔

۳۹ اہل دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ سبا آیات ۳۱-۳۳ میں ارشاد
ہوتا ہے کہ "کاش تم دیکھ سکو اُس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے
ہوں گے جو لوگ دنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ اُن لوگوں سے جو بڑے بن کر رہے تھے، کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن
ہوتے۔ بڑے بننے والے ان کمزور بنائے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے، کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جب کہ
وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔" مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دنیا کے
لاپس دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لاپس تھے جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمہیں خریدا تو تم خود بکنے کے لیے تیار تھے
جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمہیں مادہ پرستی اور دنیا پرستی اور قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا
کیا تو تم خود خدا سے بے زارا اور دنیا کے پرستار تھے جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہا
اگر ہم نے تمہیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو اُن چیزوں کی مانگ تو تمہارے ہی اندر موجود تھی جنہیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لبیک
پیک کر لیتے تھے۔ تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور
بس تمہارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت روا تمہیں گھر گھر دے دیے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ
تم خدا سے بے پروا ہو کر دنیا کے گتے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمہ وہ لے لیں۔ ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمہیں فراہم

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ
 أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي
 سَمِّ الْخِيَاطِ ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٣٠﴾ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ
 مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٣١﴾
 وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۗ
 أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعْنَا
 مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ تُجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارَ ۗ

یقین جانو، جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کی ہے ان کے
 لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی
 کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ ملا کرتا ہے۔ ان کے لیے تو جہنم کا بچھونا
 ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے
 ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کیے ہیں۔ اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت
 ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے دلوں
 میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،

کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک دہلے مزہ دینداری اور پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بجائے نجات کا کوئی اور راستہ
 بتایا جائے جس میں نفس کے یہ لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر پابندی کوئی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوش نما مذہب تمہارے
 لیے ایجاد کر دیے۔ غرض یہ کہ ذمہ داری تمہا ہمارے ہی اور نہیں ہے۔ تم بھی برابر کے ذمہ دار ہو۔ ہم اگر گمراہی فرما ہم کرنے
 والے تھے تو تم اس کے خریدار تھے۔

۳۲ یعنی دنیا کی زندگی میں ان نیک لوگوں کے درمیان اگر کچھ بخششیں، بد مزگیاں اور آپس کی غلط نہمیاں رہی

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ لَقَدْ جَاءَتْ رَسُولَنَا بِالْحَقِّ وَنُودُوا
أَنْ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٢٣﴾

التائید

اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پاسکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا، ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔" اُس وقت ندا آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں اُن اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے۔"

ہوں تو آخرت میں وہ سب دور کر دی جائیں گی۔ ان کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو جائیں گے۔ وہ مخلص دوستوں کی حیثیت سے جنت میں داخل ہوں گے۔ اُن میں سے کسی کو یہ دیکھ کر نکلیفت نہ ہوگی کہ فلاں جو میرا مخالف تھا اور فلاں جو مجھ سے لڑا تھا اور فلاں جس نے مجھ پر تنقید کی تھی، آج وہ بھی اس ضیافت میں میرے ساتھ شریک ہے۔ اسی آیت کو پڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ میرے اور عثمان اور طلحہ اور زبیر کے درمیان بھی صفائی کراوے گا۔ اس آیت کو اگر ہم زیادہ وسیع نظر سے دیکھیں تو یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صالح انسانوں کے دامن پر اس دنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان داغوں سمیت انہیں جنت میں نہ لے جائے گا بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انہیں بالکل پاک صاف کر دے گا اور وہ بے داغ زندگی لیے ہوئے وہاں جائیں گے۔

۲۳ یہ ایک نہایت لطیف معاملہ ہے جو وہاں پیش آئے گا۔ اہل جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی بلکہ وہ خدا کی حمد و ثنا اور شکر و احسان مندی میں رطب اللسان ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ ان پر اپنا احسان نہ جتانے کا بلکہ جواب میں ارشاد فرمائے گا کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلہ میں پایا ہے، یہ تمہاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمہیں دی جا رہی ہے، یہ بھیک کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ تمہاری سعی کا اجر ہے، تمہارے کام کی مزدوری ہے، اور وہ باعزت روزی ہے جس کا استحقاق تم نے اپنی قوت بازو سے اپنے لیے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ مضمون اس انداز بیان سے اور بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جواب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ نہیں فرماتا کہ ہم یوں کہیں گے بلکہ انتہائی شان کریمی کے ساتھ فرماتا ہے کہ جواب میں یہ ندا آئے گی۔

درحقیقت یہی معاملہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، اور اسی بنا پر وہ بر نعمت کے حصول پر در زیادہ



وَنَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا
وَعَدْنَا رَبَّنَا حَقًّا فَأَهْلُ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا
نَعَمْ فَإِنَّ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۳۳﴾
الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ
بِالْآخِرَةِ كَفِرُونَ ﴿۳۴﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ
يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ وَنَادُوا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلِّمُوا

وقف لازم
بأخلاف

پھر یہ جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے، ”ہم نے ان سے وعدے
کو ٹھیک پایا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے
رب نے کیے تھے؟“ وہ جواب دیں گے ”ہاں“ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکاریگا
کہ ”خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے
تھے اور آخرت کے منکر تھے۔“

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ
اور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے

منکر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں، شکر بجالاتے ہیں،
خفے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع اور رحیم و شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر آخرت کے بارے میں بھی وہ
اپنے حسن عمل پر غرور نہیں کرتے کہ ہم تو یقیناً بخشے ہی جائیں گے بلکہ اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتے ہیں، اپنے عمل کے بجائے خدا کے
رحم و فضل سے اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے حساب میں لینے کے بجائے کچھ دینا ہی نہ
نکل آئے۔ بخاری و مسلم دونوں میں روایت موجود ہے کہ حضور نے فرمایا اعلیٰ ما ان احدکم لیدخلہ علیہ الجنة۔
خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ پہنچ جاؤ گے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی
الا ان یتعد فی اللہ برحمة منہ فضل الایہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے۔

عَلَيْكُمْ لَمَّا يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٣٦﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ
 أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ
 الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٣٧﴾ وَنَادَى أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا
 يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا
 كُنْتُمْ تُسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٨﴾ أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ
 اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۗ أُدْخِلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ
 تَحْزَنُونَ ﴿٣٩﴾ وَنَادَى أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا
 عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهَا

کہ سلامتی ہو تم پر یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہونگے۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخ
 والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے، "اے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔" پھر یہ اعراف
 کے لوگ دوزخ کی چنڈ بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے
 کہ "دیکھ لیا تم نے! آج نہ تمہارے جتنے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی
 چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے
 کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا، آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں
 تمہارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے
 تمہیں دیا ہے اسی میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان منکرینِ حق پر حرام

۳۷ یعنی یہ اصحاب الاعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو ہی اتنا قوی ہوگا کہ جنت میں داخل ہو سکیں اور

نہ منفی پہلو ہی اتنا خراب ہوگا کہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں۔ اس لیے وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پر رہیں گے۔

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۱ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنََهُمْ لَهٰوًا وَّلَعِبًا وَّخَرْتَهُمْ
 الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۚ فَاَلْيَوْمَ نُنَسِّسُهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۗ
 وَمَا كَانُوْا بِآيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۵۲ وَّلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ
 عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۳ هَلْ يَنْظُرُوْنَ

کروں ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنایا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔

ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ اب کیا یہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ

۵۳۵ اہل جنت اور اہل دوزخ اور اصحاب الاعراف کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عالم آخرت میں انسان کی قوتوں کا پیمانہ کس قدر وسیع ہو جائے گا۔ وہاں آنکھوں کی بینائی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوگی کہ جنت اور دوزخ اور اعرف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوگی کہ ان مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے بات سنانی گفت و شنید کر سکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو عالم آخرت کے متعلق ہمیں قرآن میں ملتے ہیں اس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دنیا کے قوانین طبیعی سے بالکل مختلف ہوں گے اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گی جو یہاں ہیں۔ جن لوگوں کے دماغ اس عالم طبیعی کے حدود میں اس قدر مقید ہیں کہ پورے زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا وہ قرآن اور حدیث کے ان بیانات کو بڑے اچھے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مذاق اڑا کر اپنی خنیف العقل کا مزید ثبوت بھی دینے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کا دماغ جتنا تنگ ہے زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

۵۳۶ یعنی اس میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں کونسا رویہ درست ہے اور صحیح طرز زندگی کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات بھی قیاس یا گمان یا ذہم کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔

۵۳۷ مطلب یہ ہے کہ اول تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی بجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی اگر

إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسَوْهُ مِنْ قَبْلُ
 قَدْ جَاءَتْ سُرْسُلٌ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَنَا مِنْ شُفَعَاءَ
 فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلْ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ
 قَدْ خَسِرْنَا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٥٣﴾

انجام سامنے آجاتے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے جس روز وہ انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا کہیں گے کہ ”واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارش میں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں“ انہوں نے اپنے آپ کو خسار میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔

ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہِ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو مانتے ہیں ان کی زندگی میں عملاً بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ انسان کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر قبول کرتے ہی انسان کی ذہنیت، اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ان حیرت انگیز اثرات کی طرف جو اس کتاب پر ایمان لانے سے صحابہ کرام کی زندگیوں میں ظاہر ہو رہے تھے۔

۵۳۸ دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت مقبول طریقہ سے صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا، پھر اس کے سامنے کچھ لوگ صحیح راستہ پر چل کر مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں کہ غلط روی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی بہ نسبت راست روی اختیار کر کے ان کی زندگی کتنی بہتر ہو گئی ہے، مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ صرف اپنی غلط روی کی سزا پا کر ہی مانے گا کہ ہاں یہ غلط روی تھی۔ جو شخص نہ حکیم کے عاقلانہ مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفا یاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے، وہ اب بستر مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی مہلک تھے۔

۵۳۹ یعنی وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اس وقت ہم نے نہ مانا تھا، اب مشاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں، لہذا اگر ہمیں دنیا میں پھر بھیج دیا جائے

إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ هُوَ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يُطَلِّبُهُ حَيْثُمَا

در حقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت
سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور کھیر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے

تو ہمارا طرز عمل وہ نہ ہو گا جو پہلے تھا۔ اس درخواست اور اس کے جوابات کے لیے ملاحظہ ہو الانعام، آیات ۲۷-۲۸- ابراہیم ۴۴-۴۵- السجدہ ۱۲-۱۳- فاطر ۲۷- الزمر ۵۴ تا ۵۹- المؤمن - ۱۱-۱۲-

۱۷۔ یہاں دن کا لفظ یا تو اسی جو بیس گھنٹے کے دن کا ہم منی ہے جسے دنیا کے لوگ دن کہتے ہیں، یا پھر یہ لفظ دور
(Period) کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورہ حجرات میں فرمایا وَرَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ
مِمَّا تَعُدُّونَ (اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن ہزار سال کے برابر ہے اُس حساب سے جو تم لوگ لگاتے
ہو)، اور سورہ معارج کی آیت ۷۷ میں فرمایا کہ تَعْرِجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ
خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (فرشتے اور جبریل اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہے)۔
اس کا صحیح مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو عم السجدہ حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۱۸۔ خدا کے استواء علی العرش (تخت سلطنت پر جلوہ فرما کرنے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔
بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو
وہاں مرکز فرما دیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر
بھی فرمائی جا رہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقدار فرماں روائی ہو اور اس پر جلوہ فرما ہونے سے مراد یہ ہو کہ اللہ
نے کائنات کو پیدا کر کے اس کی تمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہر حال استواء علی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں
اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبّر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو
وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا
ہے۔ سلطان و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے، ذرّہ ذرّہ اس کے
فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اُس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا
ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اور کبھی خود مختاری و خود ساری کی ضلالت میں۔ خدا کو کائنات کے
انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور ان کے آگے بڑھنا
وے، یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا اور خلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ إِلَّا لَهٗ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۴۳﴾ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا

سُجُودًا اور چاند اور تارے پیدا کیے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ سائے جہانوں کا مالک پروردگار۔ اپنے رب کو پکارو گڑ گڑاتے ہوئے

زیادہ تر وہ الفاظ، مصطلحات، استعارے اور انداز بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم نادین کے معکوس دماغوں نے اس سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی تصنیف ہے اس زمانہ میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلط تھا اس لیے مصنف نے جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی وابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے، اور حاکمیت (Sovereignty) جس شخص کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے، اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے، لہذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کُلّی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبود بھی مانے اور سیاسی و تمدنی معنوں میں واحد سلطان (Sovereign) بھی تسلیم کرے۔

۱۴۲ یہ اسی مضمون کی مزید تشریح ہے جو ”استواء علی العرش“ کے الفاظ میں مجملًا بیان کیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں، اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے۔ بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یس دنہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔ سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخّر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کیے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔

۱۴۳ برکت کے حاصل معنی ہیں نمو، افزائش اور بڑھوتری کے، اور اسی کے ساتھ اس لفظ میں رفعت و عظمت کا مفہوم بھی ہے اور ثبات اور جہاد کا بھی۔ پھر ان سب مفہومات کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصور لازماً شامل ہے۔ پس اللہ کے نسبت بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں ہے، بے حد و حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں، اور وہ بہت بلند درجہ پرستی ہے، کہیں جا کر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی، اور اس کی یہ بھلائی اور رفعت مستقل ہے، عارضی نہیں ہے

کہ کبھی اس کو زوال ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، الفرقان، حواشی۔ ۱۔ ۱۹)۔



وَحَقِيقَةٌ إِنَّهُ لَا يَجِبُ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ
بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ

اور چکے چکے یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی
اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت

﴿۵۵﴾ زمین میں فساد برپا نہ کرو، یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا
دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا
کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما
ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام
میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی
سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بد نظمی سے نہیں
ہوئی ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے
اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظام
حیات کو از سر نو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور انہوں نے ہر زمانے میں انسان کو
یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطہ نظر ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر
یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بہتری
اور بہتری جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام
سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطان کی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا
رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے
کی دعوت دیں۔ (سورہ بقرہ، عاشرہ نمبر ۲۳۰)

﴿۵۶﴾ اس فقرے سے واضح ہو گیا کہ اوپر کے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل یہی ہے کہ
انسان خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست اور کارساز اور کارفرما قرار دے کر مدد کے لیے پکارے۔ اور اصلاح اس
کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان کی اس پکار کا مزاج پھر سے محض اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خوف بھی ہو تو اللہ سے ہو اور تمہاری امیدیں بھی اگر کسی سے

قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا
 بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ
 لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ
 الثَّمَرَاتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ
 الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۗ وَالَّذِي خَبثَ لَا يَخْرُجُ
 إِلَّا نَكِدًا ۗ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ يَتَشَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾

نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے
 پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سر زمین کی طرف حرکت دیتا ہے
 اور وہاں مینہ برسا کر اسی مری ہوئی زمین سے ہر طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو اس طرح
 ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین چھی ہوتی
 ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے
 ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے
 جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔

وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمہاری قسمت بالکل اس کی نظر عنایت پر منحصر
 ہے، فلاح و سعادت کو پہنچ سکتے ہو تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے اور نہ جہاں تم اس کی اعانت سے محروم ہوئے پھر تمہارے
 لیے تباہی و ناسرانی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔

۵۶۶ یہاں ایک لطیف مضمون ارشاد ہوا ہے جس پر تنبیہ ہو جانا اصل مدعا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ بارش
 اور اس کی برکتوں کے ذکر سے اس مقام پر خدا کی قدرت کا بیان اور حیات بعد الممات کا اثبات بھی مقصود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
 تمثیل کے پیرایہ میں رسالت اور اس کی برکتوں کا اور اس کے ذریعہ سے خوب و زشت میں فرق اور خبیث و طیب میں امتیاز

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو

نمایاں ہو جانے کا نقشہ دکھانا بھی پیش نظر ہے۔ رسول کی آمد اور خدائی تعلیم و ہدایت کے نزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابر رحمت کے چھا جانے اور امرت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر بارش کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کے یکایک جی اٹھنے اور اس کے بطن سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو اس حالت کے لیے بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت کے یکایک جاگ اُٹھنے اور اس کے سینے سے بھلائیوں کے خزانے اُبل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں، اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی صرف وہی انسان فائدہ اٹھاتے ہیں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسر کار آنے کا موقع نہیں ملتا۔ رہے شرارت پسند اور خبیث انسان تو جس طرح شوریل زمین باران رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اُگل دیتی ہے، اسی طرح رسالت کے ظہور سے انہیں بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خباثتیں ابھر کر پوری طرح برسر کار آجاتی ہیں۔

اسی تمثیل کو بعد کے کئی رکوعوں میں مسلسل تاریخی شواہد پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں نبی کی بعثت کے بعد انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہوتی رہی ہے۔ ایک طیب حصہ جو فیض رسالت سے پھلا اور پھولا اور بہتر برگ و بار لایا۔ دوسرا خبیث حصہ جس نے کسوٹی کے سامنے آتے ہی اپنی ساری کھوٹ نمایاں کر کے رکھ دی اور آخر کار اس کو ٹھیک اسی طرح چھانٹ کر پھینک دیا گیا جس طرح سُناہ چاندی سونے کے کھوٹ کو چھانٹ پھینکتا ہے۔

کلمہ اس تاریخی بیان کی ابتدا حضرت نوح اور ان کی قوم سے کی گئی ہے کیونکہ قرآن کی رو سے جس صالح نظام زندگی پر حضرت آدمؑ اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوحؑ کے دور میں رونما ہوا اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمایا۔

قرآن کے اشارات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائبل سے قدیم تر جو کتابت ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اُن میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کُردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بند نسل چلی آ رہی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طرفان کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے

مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ غَيْرُهُ ۗ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٩﴾
 قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرِيكَ فِي ضَلِيلٍ مُّبِينٍ ﴿٦٠﴾ قَالَ

اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک من کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔
 اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا ”ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو، نوح نے

اُس پاس آرمینیہ کی سرحد پر کوہ ادراراط کے فواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشان دہی اب بھی کی جاتی ہے، اور شہر
 نچھوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح نے ڈالی تھی۔

حضرت نوح کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے
 علاوہ برما، ملایا، جزائر شرقیہ، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی
 آ رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی تھی
 اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان
 دہی کرتی ہیں، اگرچہ سردر ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے
 مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

۱۷ یہاں اور دوسرے مقامات پر حضرت نوح اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات
 صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے نادان تھی، نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ اصل
 گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی، شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے
 استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں۔ جو خود ساختہ
 معبود خدائی میں شریک ٹھہرا لیے گئے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی سیاسی
 اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اُدب اور نیچ اور نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر
 دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھل کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک
 زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس لکھا
 تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو
 بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، مکیوں کہ اگر تو نے ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی
 نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہوگا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ہود، رکوع ۳۔ سورہ شعراء
 رکوع ۷۔ اور سورہ نوح مکمل)۔

يَقَوْمٍ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَ لَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦١﴾
 اَبْلِغْكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي وَاَنْصَحْ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٢﴾
 اَوْ عَجِبْتُمْ اَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ
 وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوهُ فَاَتَّخِذُوهُمُ
 مَعَهُ فِى الْفُلْكِ وَاَعْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِآيٰتِنَا اِنَّهُمْ

کہا "اسے برادران قوم، میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے" مگر انہوں نے اس کو جھٹلادیا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈوب دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، یقیناً

۶۲۹ یہ معاملہ جو حضرت نوح اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا بعینہ ایسا ہی معاملہ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ جو پیغام حضرت نوح کا تھا وہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ جو شبہات اہل مکہ کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے، وہی شبہات ہزاروں سال پہلے سرداران قوم نوح نے حضرت نوح کی رسالت میں ظاہر کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوح کہتے تھے بعینہ وہی باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے تھے۔ آگے چل کر دوسرے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے جو قصے مسلسل بیان ہو رہے ہیں ان میں جگہ سی دکھایا گیا ہے کہ ہرنی کی قوم کا رد تیر اہل مکہ کے رد تیر سے اور ہرنی کی تقریر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ہو ہو مشابہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی ہر زمانے میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی رہی ہے، اور خدا کے بھیجے ہوئے معلموں کی دعوت بھی ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے اور ٹھیک اسی طرح ان لوگوں کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہوا ہے اور جو گناہ جنہوں نے انبیاء کی دعوت سے منہ موڑا اور اپنی گمراہی پر اصرار کیا۔

۶۳۰ جو لوگ قرآن کے انداز بیان سے ابھی طرح واقف نہیں ہوتے وہ بسا اوقات اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سارا معاملہ بس ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا ہوگا۔ نبی اٹھا اور اس نے اپنا دعویٰ پیش کیا، لوگوں نے اعتراضات کیے

ادرنبی نے ان کا جواب دیا، لوگوں نے جھٹلایا اور اللہ نے عذاب بھیج دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت جن واقعات کو یہاں سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ مخصوص طرز بیان سب سے کہ وہ قصہ گوئی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصے کے صرف اُن اہم اجزاء کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے پھر اگر کسی قصہ کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف طور پر پیش کرتا ہے۔ مثلاً اسی قصہ نوح کو لیجیے۔ یہاں اس کے بیان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ لہذا اس مقام پر یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ پیغمبر کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتا رہا۔ لیکن یہاں یہ قصہ اس غرض کے لیے بیان ہوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کی جائے وہاں خاص طور پر دعوت نوح علیہ السلام کی طویل مدت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان حضرات اور آپ کے رفقاء اپنی چند سال کی تبلیغی سعی و محنت کو نتیجہ خیز ہوتے نہ دیکھ کر بد دل نہ ہوں اور حضرت نوح کے صبر کو دیکھیں جنہوں نے مدتہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوت حق کی خدمت انجام دی اور ذرا اہمیت نہ ہاری۔ ملاحظہ ہو سورہ عنکبوت، آیت ۱۴۔

اس موقع پر ایک اور شگ بھی لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ جب ایک شخص قرآن میں بار بار ایسے واقعات پڑھتا ہے کہ فلاں قوم نے نبی کو جھٹلایا اور نبی نے اسے عذاب کی خبر دی اور اچانک اس پر عذاب آیا اور قوم تباہ ہو گئی، تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے؟ اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور اُبھرتی بھی ہیں، لیکن اس عروج و زوال کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان یا صاعقہ آئے اور قوم کی قوم تباہ کر کے رکھ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت اخلاقی اور قانونی اعتبار سے اُس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہ راست مخاطب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلا واسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہنچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کر دے، اس پر خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے، اس کے لیے معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کے فرستادہ کو دوبارہ جھٹلا دینے کے بعد وہ اس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چکا دیا جائے۔ یہ نوعیت معاملہ اُن قوموں کے معاملہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس خدا کا پیغام براہ راست نہ آیا ہو بلکہ مختلف واسطوں سے پہنچا ہو۔ پس اگر اب اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے جیسے انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں پیش آئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ البتہ تعجب کے قابل کوئی بات ہو سکتی تھی تو یہ کہ اب بھی کسی قوم پر اسی شان کا عذاب آتا جیسا انبیاء کو دوبارہ جھٹلانے والی قوموں پر آتا تھا۔

مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اب اُن قوموں پر عذاب آنے بند ہو گئے ہیں جو خدا سے برگشتہ اور فکری و اخلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تنبیہی عذاب بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کن عذاب بھی۔ لیکن کوئی نہیں جو انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی

كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ۝۶۳ وَاللّٰی عَادِ اٰخَاهُمْ هُوْدًا ۝ قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ ۝ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۶۵

وہ اندھے لوگ تھے۔

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟“

معنی کی طرف انسان کو توجہ دلائے۔ بلکہ اس کے برعکس ظاہر ہیں سائنس دانوں اور حقیقت سے ناواقف مورخین وغلا سفہ کا ایک کثیر گروہ نوع انسانی پر تسلط ہے جو اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبعیاتی قوانین یا تاریخی اسباب سے کر کے اس کو بھلا دے میں ڈالتا رہتا ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ اوپر کوئی خدا بھی موجود ہے جو غلط کار قوموں کو پہلے مختلف طریقوں سے ان کی غلط کاری پر متنبہ کرتا ہے اور جب وہ اس کی بھیجی ہوئی نینہات سے آنکھیں بند کر کے اپنی غلط روی پر اصرار کیے چلی جاتی ہیں تو آخر کار انہیں تباہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

۱۷۷۔ یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ پھر پھر ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حمت ضرب المثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں۔ جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے اُفتادہ پڑی ہوئی ہو اُسے عادی الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرین انساب بھی اپنے ملک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنی ذہل بن شیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے وہ قصے حضور کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقہ کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔

قرآن کی رو سے اس قوم کا اصل مسکن اُحفاق کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الرّویح النّحالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل اور عُمان و حضرموت سے عراق تک اپنی طاقت کا سکہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنہیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے حضرموت میں ایک مقام پر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریزی بحری افسر (James R. wellsted) کو حصبین مغرب میں ایک پُرانا کتبہ ملا تھا جس میں حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعت ہود کے پیرو تھے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الاُحفاق،

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرِيكَ فِي سَفَاهَةٍ
 وَإِنَّا لَنَنظُرُكَ مِنَ الْكَذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ
 وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي
 وَإِنَّا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوْحَيْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ
 مِّنْ رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَأَذْكُرُوا إِذْ
 جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ
 بَصُطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا
 أَجِئْنَا لِنُعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا ”ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔“ اس نے کہا ”اے برادران قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاد رہانی آئی تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنویر کیا، پس اللہ کی قدرت کے کرموں کو یاد رکھو، اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“ انہوں نے جواب دیا ”کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا

۱۵۲ اصل میں لفظ آلاء استعمال ہوا ہے جس کے معنی نعمتوں کے بھی ہیں اور کرشمائے قدرت کے بھی اور صفات حمیدہ کے بھی

آیت کا پورا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو بھی یاد رکھو اور یہ بھی فراموش نہ کرو کہ وہ تم سے یہ نعمتیں چھین لینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

أَبَاؤُنَا فَآتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ قَالَ
 قَدْ وَقَعَ عَلَیْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رَجْسٌ وَغَضَبٌ ۚ أَتُجَادِلُونِنِیْ
 فِیْ أَسْمَاءٍ سَبَّیْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَأَبَاؤُكُمْ مَا نَزَّلَ
 اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ فَاَنْتَظِرُوا لِیْ مَعَكُمْ مِّن

کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آوہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے۔ اس نے کہا ”تمہارے بے کی
 پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹپٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ ادا نے
 رکھ لیے ہیں جن کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ

۵۳ یہاں یہ بات پھر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ قوم بھی اللہ سے منکر یا ناواقف نہ تھی اور نہ اسے اللہ کی عبادت سے
 انکار تھا۔ دراصل وہ حضرت ہود کی جس بات کو ماننے سے انکار کرتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اکیلے اللہ کی بندگی کی جائے، کسی دوسرے کی
 بندگی اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے۔

۵۴ یعنی تم کسی کو بارش کا اور کسی کو ہوا کا اور کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی
 بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ اس کی مثالیں موجودہ زمانہ میں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ کسی انسان کو لوگ مشکل کشا کہتے ہیں،
 حالانکہ مشکل کشائی کی کوئی طاقت اس کے پاس نہیں ہے۔ کسی کو گنج بخش کے نام سے پکارتے ہیں، حالانکہ اس کے پاس کوئی گنج
 نہیں کہ کسی کو بچتے۔ کسی کے لیے داتا کا لفظ بولتے ہیں، حالانکہ وہ کسی شے کا مالک ہی نہیں کہ داتا بن سکے۔ کسی کو غریب نواز کے نام
 سے موسوم کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ غریب اس اقدار میں کوئی حصہ نہیں رکھتا جس کی بنا پر وہ کسی غریب کو نواز سکے۔ کسی کو غوث
 (فریاد رس) کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ کوئی زور نہیں رکھتا کہ کسی کی فریاد کو پہنچ سکے۔ پس درحقیقت ایسے سب نام محض نام
 ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمیٰ نہیں ہے۔ جو ان کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے نہ کہ کسی حقیقت
 کے لیے۔

۵۵ یعنی اللہ جس کو تم خود بھی رب اکبر کہتے ہو، اس نے کوئی سند تمہارے ان بناوٹی خداؤں کی الہیت و ربوبیت
 کے حق میں عطا نہیں کی ہے۔ اس نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں کی طرف اپنی خدائی کا اتنا حصہ منتقل کر دیا ہے۔ کوئی پروانہ
 اس نے کسی کو مشکل کشائی یا گنج بخشی کا نہیں دیا۔ تم نے آپ ہی اپنے وہم و گمان سے اس کی خدائی کا جتنا حصہ جس کو چاہا ہے
 دے ڈالا ہے۔

الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٤١﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَقَطَعْنَا
دَابِرَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٤٢﴾ وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ
صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِن إِلَهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ

انتظار کرتا ہوں۔ آخر کار ہم نے اپنی مربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی
بڑھکٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے یا
اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادران قوم،
اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی

۵۶ جڑکٹ دی، یعنی ان کا استیصال کر دیا اور ان کا نام و نشان تک دنیا میں باقی نہ چھوڑا۔ یہ بات خود اہل عرب کی
تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے، اور موجودہ اثری اکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عاد اولی بالکل تباہ ہو گئے اور
ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں چنانچہ مورخین عرب انہیں عرب کی اُمم باندہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ
بات بھی عرب کے تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا جو حضرت ہود کا پیر و تھا۔ انہی بقایائے عاد کا نام تاریخ
میں عاد ثانیہ ہے اور حصن غراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں انہی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبہ میں درجے
تقریباً ۱۸ سو برس قبل مسیح کی تحریر سمجھا جاتا ہے) ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے چند جملے یہ ہیں:-

”ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعہ میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تگلی و بد حالی سے دور تھی، ہماری
نہریں دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں۔۔۔۔۔۔ اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو بڑے
خیالات سے پاک اور اہل شرف و نسا پر سخت تھے، وہ ہم پر ہود کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور
عدو فیصلے ایک کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے، اور ہم حجرات اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے“

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوشحالی کے وارث آخر کار
وہی لوگ ہوئے جو حضرت ہود پر ایمان لائے تھے۔

۵۷ یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نزول قرآن
سے پہلے اس کے قصے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسیرو
کے کتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے
کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے، چنانچہ رومی مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نظیوں کے



وقف لازم

بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَذُورُهَا تَأْكُلُ

کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے لہذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی

خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

اس قوم کا مسکن شمالی مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجیر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حجر کملاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں دیکڑے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوة تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزریے تو آپ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے ہر صاحب بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپ نے ایک کنویں کی نشان دہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، بانی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپ نے بتایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی فتح انامہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھرے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا، لہذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ، یہ سیرگاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

۵۵ ظاہر عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد

یہی اونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں "نشانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ شعراء آیات ۱۵۲ تا ۱۵۸ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالح سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو، اور اسی کے جواب میں حضرت صالح نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالح نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی معلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پیں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس نشان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جاسکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چرتے پھرتے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تمہارے پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پیں مبادلہ ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر پڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا، اور آلِ صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی



فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوها بِسُوءٍ فَيَأْخُذْكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤٣﴾
 وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي
 الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سَهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْجِتُونَ الْجِبَالَ
 بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوا الْآيَةَ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٤٤﴾
 قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعُّوا

زمین میں چرتی پھرتی پھرے۔ اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں
 آئے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین
 میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اُس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں
 کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور
 زمین میں فساد پر پانہ کرو۔

اُس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقہ کے اُن لوگوں سے

جس کا انہیں کوئی خوف نہ تھا، اس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اُدنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی
 زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ مگر قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اُدنی کیسی تھی اور
 کس طرح وجود میں آئی۔ کسی حدیث صحیح میں بھی اس کے معجزے کے طور پر پیدا ہونے کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے
 اُن روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسرین نے اس کی کیفیت پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور
 پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔

۵۹ شہر کی صنعت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایبورا، ایجنڈہ اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے، یعنی

وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مدائن صالح میں اب تک ان کی کچھ
 عمارتیں جوں کی توں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینیئری میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔

۶۰ یعنی عاد کے انجام سے سبق لو۔ جس خدا کی قدرت نے اُس مفسد قوم کو برباد کر کے تمہیں اس کی جگہ سر بلند کیا، وہی خدا

تمہیں برباد کر کے دوسروں کو تمہارا جانشین بنا سکتا ہے اگر تم بھی عاد کی طرح مفسدین جاؤ۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۵۷)

لِمَنْ أَمِنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنْ صَاحِبًا مُرْسَلٌ مِّنْ سَرِيٍّ ط
 قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٤٥﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
 إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿٤٦﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ
 أَمْرِ سَرِيٍّ وَ قَالُوا يُصَلِحُ اتِّتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ
 الْمُرْسَلِينَ ﴿٤٧﴾ فَآخَذَتْهُمْ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ
 جُثَيِّينَ ﴿٤٨﴾ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ
 رَبِّي وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ ﴿٤٩﴾

جو ایمان لے آئے تھے، کہا "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انہوں نے
 جواب دیا "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اُسے ہم مانتے ہیں۔" ان بڑائی کے مدعیوں
 نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔"

پھر انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے قمر کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی
 کر گزرے اور صالح سے کہہ دیا کہ لے آوہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبر
 میں سے ہے۔ آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے
 پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم،
 میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر میں کیا کروں کہ
 تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔"

اللہ اگرچہ ہر ایک شخص نے تھا، جیسا کہ سورہ قمر اور سورہ شمس میں ارشاد ہوا ہے، لیکن چونکہ پوری قوم اس مجرم کی پشت
 پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں قوم کی مرضی کا آلہ کار تھا اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق
 کیا جائے، یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو، ایک قومی گناہ ہے، خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فرد واحد ہو۔
 صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے وہ بھی قومی گناہ ہے۔

وَلَوْ طَا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ
أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤١﴾ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ

اور لو ط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم ایسے بے جیا ہو گئے ہو
کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں اپنی خواہش پوری کرتے ہو؟"

﴿٥٤١﴾ اس آفت کو یہاں "رجفہ" (اضطراب انگیز، ہلکانے والی) کہا گیا ہے اور دوسرے مقامات پر اسی کے لیے
صَيْحَةً (چیخ)، "صاعقہ" (درواکا) اور "طاغیہ" (دسخت زور کی آواز) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

﴿٥٤٢﴾ یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرق اردن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین
کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے جو یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا
یا اب بحیرہ مردار میں غرق ہو چکا ہے۔ تلمود میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں
کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پرستی طاری ہونے لگتی تھی۔
مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب
صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و
مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح
پر مامور ہوئے۔ اہل سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہوگا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائبل میں حضرت لوط کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں وہاں ایک
دھبہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳-آیت ۱-۱۲)۔ مگر قرآن اس
غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انہیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔

﴿٥٤٣﴾ دوسرے مقامات پر اس قوم کے بعض اور اخلاقی جرائم کا بھی ذکر آیا ہے، مگر یہاں اس کے سب سے بڑے جرم کے
بیان پر اکتفا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خدا کا عذاب اس پر نازل ہوا۔

یہ قابل نفرت فعل جس کی بدولت اس قوم نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز
نہیں آئے، لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اٹھانے کی
کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے جدید مغربی تہذیب نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا
یہاں تک کہ بعض ملکوں کی مجالس قانون ساز نے اسے باقاعدہ جائز ٹھہرا دیا۔ حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ مباشرت

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا
 أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ﴿۸۲﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ

حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا
 کچھ نہ تھا کہ نکالو ان لوگوں کو اپنی بسبتوں سے، بڑے پاکیزہ بنتے ہیں یہ۔ آخر کار ہم نے لوط اور

ہم جنس قطعی طور پر وضع فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات الوجود میں زود مادہ کا فرق محض تناسل اور بقائے نوع کے لیے
 رکھا ہے اور نوع انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اس سے
 تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت کی دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں، ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی
 گئی ہے، ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصد زوجیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے اور
 ان کے جذبہ و انجذاب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشاء کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت دائمی و محرک بھی ہے اور اس
 خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کرے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت
 میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اولاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خلل عظیم
 برپا کر دیتا ہے جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت
 کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فریضہ اور ذمہ داریوں اور
 حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا وہ اسے کسی خدمت کی بجائے آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر
 پُر لیتا ہے۔ ثالثاً وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اٹھا
 لیتا ہے مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فریضہ اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ
 ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ لہجاً با مفسرت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور
 خاندان کی خدمت کے لیے تامل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے، اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی
 صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

۸۱ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف بے حیا اور بد کردار اور بد اخلاق ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے
 کہ انہیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا۔ وہ بدی
 میں یہاں تک غرق ہو چکے تھے کہ اصلاح کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاپی کے اس ٹھوڑے سے عفر کو بھی نکال دینا
 چاہتے تھے جو ان کی گھناؤنی نفس میں باقی رہ گیا تھا۔ اسی حد کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے استیصال کا فیصلہ صادر
 ہوا۔ کیونکہ جس قوم کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا عنصر بھی باقی نہ رہ سکے پھر اسے زمین پر زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

وَأَهْلَةٌ إِلَّا امْرَأَتَهُ زَهْدًا كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۸۳﴾ وَأَمْطَرْنَا
عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿۸۴﴾

اس کے گھر والوں کو۔۔۔ بجز اس کی بیوی کے جو چھپے رہ جانے والوں میں تھی۔۔۔ بچاکر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ع

جوئے پھول کے ٹوکے میں جب تک چنداچھے پھل موجود ہوں اس وقت تک تو ٹوکے کو رکھا جاسکتا ہے، مگر جب وہ پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکے کا کوئی مصرت اس کے سوا نہیں رہتا کہ اُسے کسی گھوڑے پر اٹھ دیا جائے۔

۸۳ دوسرے مقامات پر تصریح ہے کہ حضرت لوط کی بیوی، جو غالباً اسی قوم کی بیٹی تھی، اپنے کافر رشتہ داروں کی ہمنوا رہی اور آخر وقت تک اس نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس لیے عذاب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط اور ان کے ایمان دار ساتھیوں کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو ہدایت فرمادی کہ اس عورت کو ساتھ نہ لیا جائے۔

۸۴ بارش سے مراد یہاں پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے جیسا کہ دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ نیز یہ بھی قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کی بستیاں اُلٹ دی گئیں اور انہیں تپٹ کر دیا گیا۔

۸۵ یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ عمل قوم لوط ایک بدترین گناہ ہے جس پر ایک قوم اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہوئی۔ اس کے بعد یہ بات ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے معلوم ہوئی کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرے کو پاک رکھنے کی کوشش کرنا حکومت اسلامی کے فرائض میں سے ہے اور یہ کہ اس جرم کے مرتکبین کو سخت سزا دی جانی چاہیے۔ حدیث میں مختلف روایات جو حضور سے مروی ہیں ان میں سے کسی میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں کہ اقتلوا الفاعل والمفعول یہ (فاعل اور مفعول کو قتل کر دو) کسی میں اس حکم پر اتنا اضافہ اور ہے کہ احصنا اولہ یحصنا (شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ)۔ اور کسی میں ہے فارجموا الا علی والاسفل (اوپر اور نیچے والا، دونوں سنگسار کیے جائیں)۔ لیکن چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا اس لیے قطعی طور پر یہ بات متعین نہ ہو سکی کہ اس کی سزا کس طرح دی جائے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علی کی رائے یہ ہے کہ مجرم تلوار سے قتل کیا جائے اور دفن کرنے کے بجائے اس کی لاش جلانی جائے۔ اسی رائے سے حضرت ابو بکر نے اتفاق فرمایا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کی رائے یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے وہ عمارت ان پر ڈھادی جائے۔ ابن عباس کا فتویٰ یہ ہے کہ بستی کی سب سے اونچی عمارت پر سے ان کو سر کے بل پھینک دیا جائے اور اوپر سے پتھر برسائے جائیں۔ فقہاء میں سے امام شافعی کہتے ہیں کہ فاعل و مفعول واجب القتل ہیں خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شعبی، ماہری، مالک اور احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ان کی سزا رجم ہے۔ سعید بن مسیب، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اوزاعی رحمہم اللہ کی رائے میں اس جرم پر وہی سزا دی جائے گی جو زنا کی سزا ہے، یعنی

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ أَهْلِ مَدْيَنَ وَآخَاهُمْ تُسْعِبًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ

اور مَدینہ والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی ثعبان کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی

غیر شادی شدہ کو ستو کوڑے مار سے جائیں گے اور جلا وطن کر دیا جائے گا۔ اور شادی شدہ کو رجم کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کی رائے میں اس پر کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ یہ فعل لغزیر کا مستحق ہے، جیسے حالات و ضروریات ہوں ان کے لحاظ سے کوئی عبرت ناک سزا اس پر دی جاسکتی ہے۔ ایک قول امام شافعی سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔

معلوم رہے کہ آدمی کے لیے یہ بات قطعی حرام ہے کہ وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ عمل قوم لوط کرے۔ ابو داؤد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ملعون من اتى المرأة في دبرها (عورت سے یہ فعل کرنے والا ملعون ہے)۔ ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضور کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ لا ينظر الله الى رجل جامع امرأة في دبرها (اللہ اس مرد کی طرف ہرگز نظر رحمت سے نہ دیکھے گا جو عورت سے اس فعل کا ارتکاب کرے)۔ ترمذی میں آپ کا یہ فرمان ہے کہ من اتى حائضاً او امرأة في دبرها او كاهنا فصدقه فقد كفر بما انزل على محمد (جس نے حائضہ عورت سے مجامعت کی یا عورت کے ساتھ عمل قوم لوط کا ارتکاب کیا، یا کاهن سے پاس گیا اور اس کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کی اس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے)۔

۵۶۹ مَدینہ کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا مگر جزیرہ نما سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہ راہ بحر احمر کے کنارے عین سے مکہ اور یمن سے تھی، اور ایک دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مَدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی۔ کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہل مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات، جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قُطُوراء کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانہ کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی نسلان کہلانے لگتے تھے اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولاد یعقوب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والے لوگ سب سے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مَدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی جو مدیان بن ابراہیم علیہ السلام کے زیر اثر آئی، بنی مدیان کہلائی اور ان کے ملک کا نام ہی مدین یا مدیان مشہور ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دین حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت ثعبان کے ذریعہ سے پہنچی تھی۔ درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداء وہ بھی مسلمان ہی تھے اور ثعبان علیہ السلام کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان

مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيْنَهُ مِنْ شَرِيكُمْ فَأَوْفُوا
 الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَفْسِدُوا
 فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ
 مُؤْمِنِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ
 عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۗ وَادْكُرُوا آيَاتِ

کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے،
 لہذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھٹانہ دو، اور زمین میں فساد برپا نہ کرو
 جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے)
 ہر راستے پر رہن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے
 راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جبکہ

قوم کی سی تھی جیسی ظہورِ نبوی علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد چھ سات سو برس تک
 مشرک اور بد اخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بد اخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے، مگر
 اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔

۵۵ اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم میں دو بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک شرک، دوسرے تجارتی معاملات میں
 بددیانتی۔ اور انہی دونوں چیزوں کی اصلاح کے لیے حضرت شعیب مبعوث ہوئے تھے۔

۵۶ اس فقرے کی جامع تشریح اسی سورۃ الاعراف کے حواشی ۴۴ و ۴۵ میں گزر چکی ہے۔ یہاں خصوصیت کے
 ساتھ حضرت شعیب کے اس قول کا اشارہ اس طرف ہے کہ دین حق اور اخلاقی صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیائے سابقین کی ہدایت
 رہنمائی میں قائم ہو چکا تھا، اب تم اسے اپنی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی بدراہمیوں سے خراب نہ کرو۔

۵۷ اس فقرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعی ایمان تھے۔ جیسا کہ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ دراصل گویے
 ہوئے مسلمان تھے اور اعتقادی و اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ باقی تھا بلکہ اس پر
 انہیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیب نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارے نزدیک خیر اور بھلائی راستبازی اور دیانت
 میں ہونی چاہیے اور تمہارا میاں خیر و شر ان دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے۔

كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ وَاَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾
 وَإِنْ كَانَ ظَاقِفَةٌ مِّنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَظَاقِفَةٌ
 لَّمْ يُؤْمِنُوا فَأَصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ

يُتْعَبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قُرْبَيْنَا أَوْ لَنَعُودَنَّ فِي
 مِلَّتِنَا قَالَ أَوْلَوْكُنَّا كَرِهِينَ ﴿٨٨﴾ قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا
 إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ بَخَّسْنَا اللَّهُ مِنْهَا وَمَا
 يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ سَرِيًّا

تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا، اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام
 ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا
 ایمان نہیں لاتا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے،
 اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے اس سے کہا کہ ”اے شعیب،
 ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری
 قلت میں واپس آنا ہوگا“ شعیب نے جواب دیا ”کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟“
 ہم اللہ پر چھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری قلت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات
 دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔

ملکہ یہ فقرہ اسی معنی میں ہے جس میں ان شاء اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے، اور جس کے متعلق سورہ کہف آیات ۲۲-۲۳

میں ارشاد ہوا ہے کہ کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ نہ کہہ دیا کرو کہ میں ایسا کروں گا بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اگر اللہ چاہے گا تو ایسا

وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ
 بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ
 الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ
 إِذًا لَخُسْرَونَ ﴿۹۰﴾ فَآخَذَتْهُمْ الرِّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي

ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب، ہمارے اور ہماری

قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کی قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا "اگر تم نے

شعیب کی پیروی قبول کر لی تو رباد ہو جاؤ گے۔" مگر ہوا یہ کہ ایک ہلا دینے والی آفت نے ان کو آیا اور وہ

کروں گا۔ اس لیے کہ زمین، جو اللہ تعالیٰ کی سلطان و بادشاہی کا اور اپنی بندگی و تابعت کا ٹھیک ٹھیک ادراک رکھتا ہے، کبھی اپنے بل
 برتے پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں غلام بات کر کے رہوں گا یا غلام حرکت سرگزنہ کروں گا، بلکہ وہ جب کہے گا تو یوں کہے گا کہ
 میرا ارادہ ایسا کرنے کا یا نہ کرنے کا ہے لیکن میرے اس ارادے کا پورا ہونا میرے مالک کی مشیت پر موقوف ہے، وہ تو فریق
 بخشے گا تو اس میں کامیاب ہو جاؤں گا ورنہ ناکام رہ جاؤں گا۔

۸۹۔ اس چھوٹے سے فقرے پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے۔ یہ ٹھیک کریمت سوچنے کا مقام ہے۔ تمدن کے سردار اور

لیڈر دراصل یہ کہہ رہے تھے اور اسی بات کا اپنی قوم کو بھی یقین دلارہے تھے کہ شعیب جس ایمان داری اور راست بازی کی دعوت

دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے، اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔

ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی دو

سب سے بڑی تجارتی شاہ راہوں کے چوراہے پر بستے ہیں، اور مصر و عراق کی عظیم الشان تمدن سلطنتوں کی سرحد پر آیا دیں، اگر

ہم قافلوں کو چھوڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پر امن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافیائی

پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے

گی۔ یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں گڑھے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی

اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور

دوسرے دنیوی معاملات مجھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلہ میں جزبہ و دست



دَارِهِمْ جَثِيئِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَبُوا شُعَيْبًا كَانُوا لَمْ يَعْنُوا
 فِيهَا الَّذِينَ كَذَبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخٰسِرِينَ ﴿٩٢﴾
 فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَتِ
 رَبِّي وَنَعَيْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ أَصْبَأُكُمْ عَلَى قَوْمِ كٰفِرِينَ ﴿٩٣﴾

اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے
 کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے۔ اور
 شعیب یہ کہہ کر ان کی بستنیوں سے نکل گیا کہ ”اے براور ان قوم، میں نے اپنے رب کے پیغامات
 تمہیں پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اُس قوم پر کیسے افسوس کروں جو
 قبولِ حق سے انکار کرتی ہے۔“

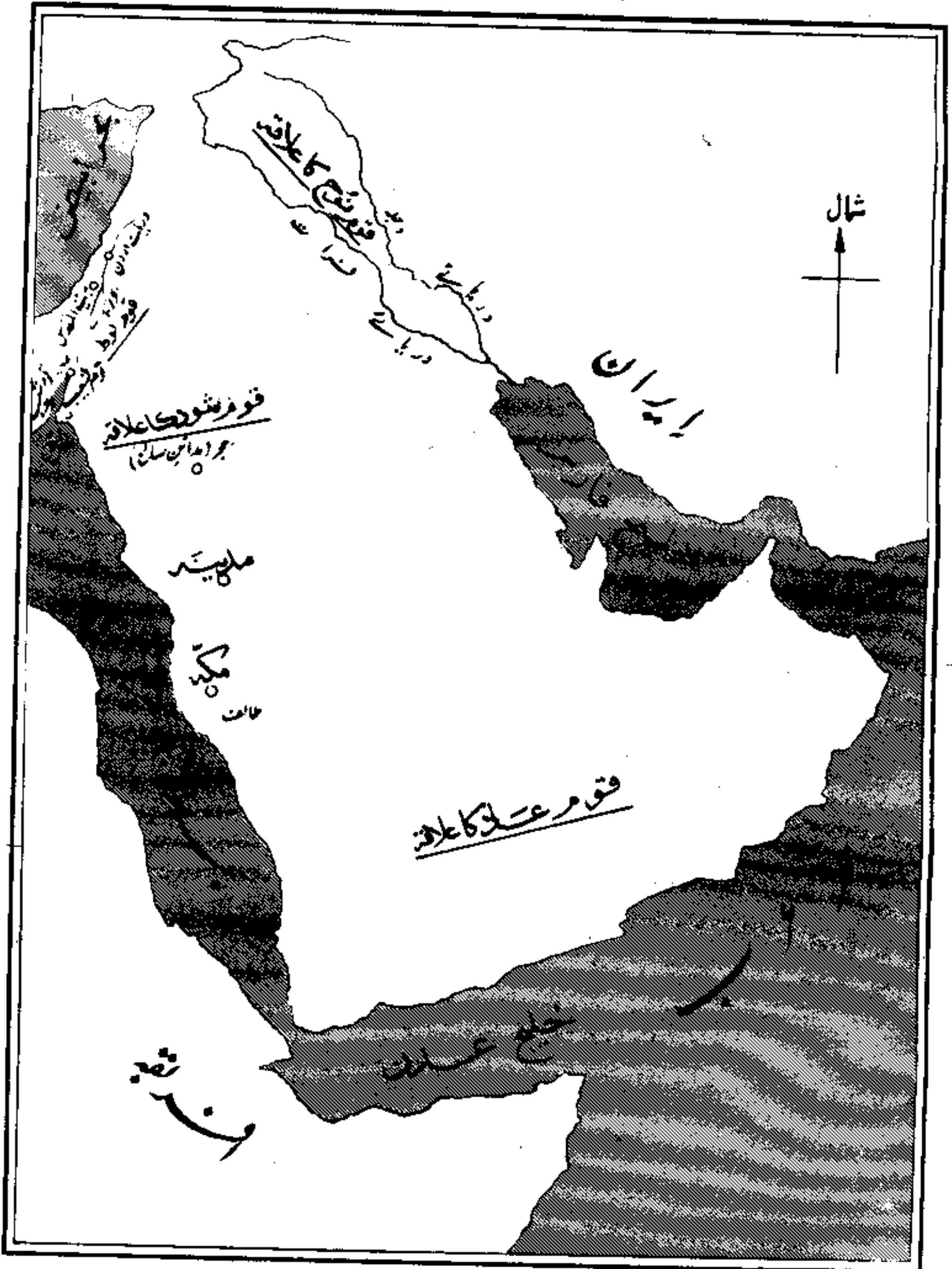
عذرات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے
 گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔

۹۵ء مدین کی یہ تباہی مدتہائے دراز تک اُس پاس کی قوموں میں ضرب النثل رہی ہے۔ چنانچہ زبور داؤد میں ایک
 جگہ آتا ہے کہ اے خدایا فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے لہذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مدیان
 کے ساتھ کیا (۸۳-۵ تا ۹)۔ اور نسیعہ بنی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو،
 اگرچہ وہ تمہارے لیے مصیبتوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا
 اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مدیان کا ہوا (یسعیاہ: ۱۰-۲۱ تا ۲۶)۔

۹۶ء یہ جتنے قصے یہاں بیان کیے گئے ہیں ان سب میں ”سردلیہاں در حدیث دیگران“ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر
 قصہ اُس معاملہ پر پورا پورا چسپاں ہوتا ہے جو اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ ہر
 قصہ میں ایک فریق بنی ہے جس کی تعلیم، جس کی دعوت، جس کی نصیحت و خیر خواہی، اور جس کی ساری باتیں بعینہ وہی ہیں جو محمد صلی اللہ
 علیہ وسلم کی تھیں۔ اور دوسرا فریق حق سے منہ موڑنے والی قوم ہے جس کی اعتقادی گمراہیاں، جس کی اخلاقی خرابیاں، جس کی
 جاہلانہ ہٹ دھرمیاں، جس کے سرداروں کا استکبار، جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار، غرض سب کچھ وہی
 ہے جو قریش میں پایا جاتا تھا۔ پھر ہر قصے میں منکر قوم کا جو انجام پیش کیا گیا ہے اس سے دراصل قریش کو عبرت دلانی

ان قوموں کے علاقے جن کا ذکر سورہ اعراف میں آیا ہے

بڑے الاعراف رکوع (۱۱)
صفحہ ۵۸-۵۹



وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ﴿۹۳﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ
الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءُنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ
فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو، اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بد حالی کو خوش حالی بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ”ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور بُرے دن آتے ہی رہے ہیں“۔ آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اگر بستیوں کے

گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بات نہ مانی اور اصلاح حال کا جو موقع تمہیں دیا جا رہا ہے اسے اندھی ضد میں مبتلا ہو کر کھو دیا تو آخر کار تمہیں بھی اسی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی و فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصہ میں آتی رہی ہے۔

۹۳ ایک ایک نبی اور ایک ایک قوم کا معاملہ الگ الگ بیان کرنے کے بعد اب وہ جامع ضابطہ بیان کیا جا رہا ہے جو ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے موقع پر اختیار فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی بھیجا گیا تو پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبول دعوت کے لیے نہایت سازگار بنایا گیا۔ یعنی اس کو مصائب اور آفات میں مبتلا کیا گیا۔ قحط، وبا، تجارتی خسارے، جنگل شگست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں اس پر ڈالی گئیں۔ تاکہ اس کا دل نرم پڑے، اس کی شیخی اور تکبر سے اکرٹی ہوئی گردن ڈھیلی ہو، اس کا غرورِ طاقت اور نشہ دولت ٹوٹ جائے، اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور قابلیتوں پر اس کا اعتماد شکست ہو جائے، اُسے محسوس ہو کہ اوپر کوئی اور طاقت بھی ہے جس کے ہاتھ میں اس کی قسمت کی باگیں ہیں، اور اس طرح اس کے کان نصیحت کے لیے کھل جائیں اور وہ اپنے خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ جھک جانے پر آمادہ ہو جائے۔ پھر جب اس سازگار ماحول میں بھی اس کا دل قبول حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو اس کو خوش حال کے فتنہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور یہاں سے اس کی بربادی کی تمہید شروع ہو جاتی ہے۔ جب وہ نعمتوں سے مالا مال ہونے لگتی ہے تو اپنے بُرے دن بھول جاتی ہے اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا اُتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ اور بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی نیادوں پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی

الْقُرَىٰ آمَنُوا وَانْقَلَبُوا لِنَحْنِ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَ

لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے

اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی بُرے دن لاتی ہی رہتی ہے، لہذا مصائب اور آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قبول کر کے خدا کے آگے زاری و تضرع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ احتمالانہ ذہنیت ہے جس کا نقشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کھینچا ہے: لا یزال البلاء بالمؤمن حتی ینجیح نقیباً من ذنوبہ، والمنافع مثله کمثل الحمار کا یداری فیہم سربطہ اہلہ ولا فیہم اسر سلوک۔ یعنی ”مصیبت مومن کی تو اصلاح کرنی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے، لیکن منافق کھالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باتدھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا۔“ پس جب کسی قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ مصائب سے اس کا دل خدا کے آگے جھکتا ہے، نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے، اور نہ کسی حال میں اصلاح قبول کرتی ہے تو پھر اس کی بربادی اس طرح اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے جیسے پورے دن کی حاملہ عورت کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطہ کا ذکر فرمایا ہے ٹھیک وہی ضابطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے موقع پر بھی برتا گیا اور شامت زدہ قوموں کے جس طرز عمل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ٹھیک وہی طرز عمل سورۃ الاعراف کے نزول کے زمانہ میں قریش والوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ حدیث میں عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباسؓ دونوں کی متفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپ کی دعوت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا شروع کیا تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا، یوسف کے زمانہ میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا ویسے ہی قحط سے ان لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا اور زوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مردار کھانے لگے، چمڑے اور ہڈیاں اور اون تک کھا گئے۔ آخر کار مکہ کے لوگوں نے، جن میں البرسعیان پیش پیش تھا، حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے خدا سے دعا کیجیے۔ مگر جب آپ کی دعا سے اللہ نے وہ بُرا وقت ٹال دیا اور پچھلے دن آٹے تو ان لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکر گئیں، اور جن کے دل تھوڑے بہت سیج گئے تھے ان کو بھی اشرار قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں، یہ تو زمانے کا اتار چڑھاؤ ہے۔ پہلے بھی آخر قحط آتے ہی رہے ہیں، کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا، لہذا ان چیزوں سے بھوکا کھا کر محمدؐ کے چھندے میں نہ پھنس جانا۔ یہ تقریریں اس زمانے میں ہو رہی تھیں جب یہ سورۃ الاعراف نازل ہوئی ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہوتی ہیں اور اسی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ان کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو یونس، آیت ۲۱۔ النحل ۱۱۳۔ المؤمنون ۵۔ ۷۔ الذخاں ۴۔ ۱۶)۔

الْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۶﴾
 أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ
 نَائِمُونَ ﴿۹۷﴾ أَوْ آمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًىٰ وَ
 هُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا يُأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا
 الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ
 بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصْبَنَهُم بِذُنُوبِهِمْ وَنَطْبَعُ

دروائے کھول دیتے، مگر انہوں نے تو جھٹلایا، لہذا ہم نے اس بُری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا
 جو وہ سمیٹ رہے تھے۔ پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت
 کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوتے پڑے ہوں، یا انہیں اطمینان
 ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی بیکام ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے
 ہوں، کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں، حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف
 ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے ارث ہوتے ہیں اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ
 اگر ہم چاہیں تو ان کے قصور پر انہیں پکڑ سکتے ہیں، (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے

۹۶ اصل میں لفظ حکو استعمال ہوا ہے جس کے معنی عمرانی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی
 چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کن ضرب نہ پڑ جائے اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو
 دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

۹۷ یعنی ایک گرنے والی قوم کی جگہ جو دوسری قوم اٹھتی ہے اس کے لیے اپنی پیش رو قوم کے زوال میں کافی رہنمائی موجود
 ہوتی ہے۔ وہ اگر عقل سے کام لے تو سمجھ سکتی ہے کہ کچھ مدت پہلے جو لوگ اسی جگہ راہِ عیش و سرور سے رہے تھے اور جن کی عظمت کا جھنڈا

عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰﴾ تِلْكَ الْقُرْآنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ
 مِنْ أَنْبَاءِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانُوا
 لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۱﴾
 وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۚ وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿۱۲﴾

دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔ یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنارہے ہیں تمہارے
 سامنے مثال میں موجود ہیں، ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو
 وہ ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے پھر اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اس طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر
 مہر لگا دیتے ہیں۔ ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔

یہاں لہرا رہا تھا انہیں ٹکروٹل کی کن غلطیوں نے برباد کیا، اور یہ بھی محسوس کر سکتی ہے کہ جس بالاتر اقتدار نے کل انہیں ان کی غلطیوں پر
 پکڑا تھا اور ان سے یہ جگہ خالی کرائی تھی، وہ آج کہیں چلا نہیں گیا ہے، نہ اس سے کسی نے یہ قدرت چھین لی ہے کہ اس جگہ کے موجود
 ساکنین اگر وہی غلطیاں کریں جو سابق ساکنین کر رہے تھے تو وہ ان سے بھی اسی طرح جگہ خالی نہ کر سکے گا جس طرح اس نے ان سے
 خالی کرائی تھی۔

۷۸ یعنی جب وہ تاریخ سے اور عبرتناک آثار کے مشاہدے سے سبق نہیں لیتے اور اپنے آپ کو خود بھلا دے ہیں
 ڈالتے ہیں تو پھر خدا کی طرف سے بھی انہیں سوچنے سمجھنے اور کسی ناصح کی بات سننے کی توفیق نہیں ملتی۔ خدا کا قانون فطرت ہی ہے کہ
 جو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اس کی بینائی تک آفتابِ روشن کی کوئی کرن نہیں پہنچ سکتی اور جو خود نہیں سننا چاہتا اسے پھر کوئی کچھ
 نہیں سنا سکتا۔

۷۹ پچھلے آیت میں جو ارشاد ہوا تھا کہ ”ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے“، اس کی تشریح اللہ تعالیٰ
 نے اس آیت میں خود فرمادی ہے۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دلوں پر مہر لگانے سے مراد ذہن انسانی کا اس
 نفسیاتی قانون کی زد میں آجانا ہے جس کی زد سے ایک دفعہ جاہلی تعصبات یا نفسانی اعراض کی بنا پر حق سے منہ موڑ لینے کے بعد پھر
 انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے الجھاؤ میں الجھتا ہی چلا جاتا ہے اور کسی دلیل، کسی مشاہدے اور کسی تجربے سے اس کے دل
 کے دروازے قبولِ حق کے لیے نہیں کھلتے۔

۸۰ ”کوئی پاس عہد نہ پایا“ یعنی کسی قسم کے عہد کا پاس بھی نہ پایا، نہ اس فطری عہد کا پاس جس میں پیدائشی طور پر ہر

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا

پھر ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر انہوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا،

انسان خدا کا بندہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے، نہ اس اجتماعی عہد کا پاس جس میں ہر فرد بشر انسانی برادری کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے، اور نہ اس ذاتی عہد کا پاس جو آدمی اپنی مہبت اور پریشانی کے لمحوں میں یا کسی جذبہ خیر کے موقع پر خدا سے بطور خود باندھا کرتا ہے۔ انہی تینوں عہدوں کے توڑنے کو یہاں فسق قرار دیا گیا ہے۔

۵۸۳ اور جو قصے بیان ہوئے ان سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے اسے پھر ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کے بعد اب موسیٰ و فرعون اور بنی اسرائیل کا قصہ کئی رکوعوں تک مسلسل چلتا ہے جس میں اس مضمون کے علاوہ چند اور اہم سبق بھی کفار قریش، یہود اور ایمان لانے والے گروہ کو دیے گئے ہیں۔

کفار قریش کو اس قصے کے پیرائے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوت حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا ہے، اُس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ حق کی توپوری تاریخ ہی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک نئی قوم بلکہ ایک نئی دنیا کی اقلیت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی سرد سامان کے اُس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے، پھر بھی آخر کار وہی غالب آکر رہتا ہے۔ نیز اس قصے میں ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داعی حق کے مقابلہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اُس کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح اُلٹی پڑتی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اُن کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دینا چلا جاتا ہے اور جب کسی تشبیہ، کسی سبق آموز واقعے اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اتر نہیں لیتے تو پھر وہ انہیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کو اس قصے میں دوسرا سبق دیا گیا ہے۔ پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلت و کمزوری کو اور مخالفین حق کی کثرت و شوکت کو دیکھ کر اُن کی ہمت نہ ٹوٹے اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی روش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں ہی کی طرح خدا کی لعنت میں گرفتار بھی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے سامنے ان کی اپنی عبرتناک تاریخ پیش کر کے انہیں باطل پرستی کے بُرے نتائج پر متنبہ کیا گیا ہے اور اُس پیغمبر پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو پچھلے پیغمبروں کے لاٹے ہوئے دین کو تمام آمیزشوں سے پاک کر کے پھر اس کی اصلی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

۵۸۴ نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، یعنی ان کو نہ مانا اور انہیں جادوگری قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ جس طرح کسی

فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوسَى
يَفْرَعُونَ اِنِّى رَسُوْلٌ مِّنْ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰى اَنْ
لَّا اَقُوْلَ عَلٰى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۗ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ

پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

موسیٰ نے کہا "اے فرعونؑ، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب
یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے

ایسے شعر کو جو شعریت کا مکمل نمونہ ہو، تنگ بندی سے تعبیر کرنا اور اس کا مذاق اڑانا نہ صرف اس شعر کے ساتھ بلکہ نفس شاعری اور ذوق
شعری کے ساتھ بھی ظلم ہے، اسی طرح وہ نشانیاں جو خود اپنے من جانب اللہ ہونے پر صریح گواہی دے رہی ہوں اور جن کے
متعلق کوئی صاحب عقل آدمی یہ گمان تک نہ کر سکتا ہو کہ سحر کے زور سے بھی ایسی نشانیاں ظاہر ہو سکتی ہیں، بلکہ جن کے متعلق خود فرعون
سحر کے ماہرین نے شہادت دے دی ہو کہ وہ ان کے فن کی دست رس سے بالاتر ہیں، ان کو سحر قرار دینا نہ صرف ان نشانیوں کے
ساتھ بلکہ عقل سلیم اور صداقت کے ساتھ بھی ظلم عظیم ہے۔

۱۰۳ لفظ فرعون کے معنی ہیں "سورج دیزتالی اولاد" قدیم اہل مصر سورج کو جو ان کا مہادیویار پ اعلیٰ تھا، سماع کہتے تھے
اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی
تھی کہ وہ سماع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو، اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسر اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو
سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تخت نشین ہوتا، فرعون "کالقب اختیار کر کے باسندگان ملک کو یقین دلاتا
کہ تمہارا پ اعلیٰ یا مہادیوی ہیں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک
وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور نبی
اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانہ کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رئیس
دوم تھا جس کا زمانہ حکومت ۱۲۹۲ء سے ۱۲۲۵ء قبل مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ان آیات میں ذکر ہو رہا ہے،
منفستہ یا منفتح تھا جو اپنے باپ رئیس دوم کی زندگی ہی میں شریک حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا
مالک ہوا۔ یہ قیاس بظاہر اس لحاظ سے مشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ علیٰ تاریخ وفات ۱۲۶۲ء
قبل مسیح ہے۔ لیکن بہر حال یہ تاریخی قیاسات ہی ہیں اور مصری، اسرائیلی اور عیسوی جنتریوں کے تطابق سے بالکل صحیح تاریخوں کا

سَرِيكُمۡ فَاَرْسِلۡ مَعِيَ بَنِيۡۤ اِسْرٰٓءِٖلَ ۝۱۰۵ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِدَّتۡ بِاٰیَةٍۤ
 فَاتِّ بِهَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ۝۱۰۶ فَالْقٰی عَصَاۤهُ فَاِذَا هِیَ
 تَعْبٰۤاۡنٌ مُّبِیۡنٌ ۝۱۰۷ وَتَرَعۡ يَدَہٗ فَاِذَا هِیَ بَیضَاۡءٌ لِّلنّٰظِرِیۡنَ ۝۱۰۸

صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں، لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

فرعون نے کہا ”اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو ابے پیش کر۔“

موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکا یک وہ ایک جتیا جاگتا اڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے

ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔

حساب لگانا مشکل ہے۔

۵۸۶ حضرت موسیٰ علیہ السلام دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس بھیجے گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام)

قبول کرے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی اپنے نیچے ظلم سے رہا کر دے۔ قرآن میں ان دونوں دعوتوں کا کہیں کیجا ذکر کیا گیا ہے اور کہیں موقع محل کے لحاظ سے صرف ایک ہی کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۵۸۷ یہ دو نشانیاں حضرت موسیٰؑ کو اس امر کے ثبوت میں دی گئی تھیں کہ وہ اُس خدا کے نمائندے ہیں جو کائنات کا خالق

اور فرماں روا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، پیغمبروں نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادہ رب العالمین کی حیثیت

سے پیش کیا تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی رب العالمین کے نمائندے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور

میں آنا چاہیے جو تو انہیں فطرت کی عام روش سے ہٹا ہو، ہوا اور جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہو کہ رب العالمین نے تمہاری صداقت

ثابت کرنے کے لیے اپنی براہ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اسی مطالبہ کے جواب میں انبیاء نے وہ نشانیاں

دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں ”آیات“ اور متکلمین کی اصطلاح میں ”معجزات“ کہا جاتا ہے۔ ایسے نشانات یا معجزات کو جو لوگ

قوانین فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت کتاب اللہ کو ماننے اور نہ

ماننے کے درمیان ایک ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس لیے کہ قرآن جس جگہ صریح طور پر خارق

عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی جدوجہد محض ایک بھونڈی سخن سازی ہے

جس کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارق عادت واقعات کا

ذکر کرتی ہو اور دوسری طرف آباؤ اجداد کے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اُس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع

خارق عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۰۹﴾
 أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوا أَرْجِهْ

اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے" اب کہو کیا کہتے ہو؟ پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے

معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطل ہو چکا ہے اور اب اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا؟ یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی تمام تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اس کے احکام اس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ دنیا کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے؟ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے نائل ہیں ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے، کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصورِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصورِ کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے اس کا صاف صاف انکار کر دیں کیونکہ قرآن نے تو اپنا زور بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصور کا ابطال اور مؤخر الذکر تصور کا اثبات کرنے پر صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کرے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کا عقیدہ ہی یہ ہو گا کہ اژدہ ہے جس طرح پیدا ہوا کرتے ہیں اسی طرح وہ پیدا ہو سکتے ہیں، اس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اژدہ یا پیدا کر دینا خدا کی قدرت سے باہر ہے، تو آپ مجبور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر جھٹلا دیں جو آپ کو خبر دے رہا ہو کہ ایک لاشی اژدہ ہے میں تبدیل ہوئی اور پھر اژدہ ہے سے لاشی بن گئی۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادے کو جیسی چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے، اس کے لیے خدا کے حکم سے لاشی کا اژدہ بنا دینا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادوں کا اژدہ بن جانا غیر عجیب ہے۔ مجھ تو یہ فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور دوسرا واقعہ صرف تین تین بار پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۵۵۵ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سرو سامان آدمی یکایک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو نام سے لیبیا تک اور بحر روم کے سواصل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا، تو محض اس کے اس فعل سے کہ اس نے ایک لاشی کو اژدہ بنا دیا اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنتِ مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقے سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جبکہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا

وَآخَاهُ وَارْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ﴿۱۱﴾ يَا تُولَكُ بِكُلِّ سِحْرِ

اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہر کارنیے بھیج دیجیے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے

اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوا سے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ اصل پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو منقہ منہ ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سننے ہی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و سماجی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔ یہی بات کہ حضرت موسیٰ کے اس دعوے کو مصر کے دربار شاہی میں اتنی اہمیت ہی کیوں دی گئی جبکہ ان کے ساتھ ایک بھائی کے سوا کوئی معاون و مددگار اور صرف ایک سانپ بن جانے والا لاکھی اور ایک پھکنے والے ہاتھ کے سوا کوئی نشان ماموریت نہ تھا، تو میرے نزدیک اس کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے فرعون اور اس کے درباری خوب واقف تھے۔ ان کی پاکیزہ اور مضبوط سیرت، ان کی غیر معمولی قابلیت، اور قیادت و فرماں روائی کی پیدائشی صلاحیت کا سب کو علم تھا۔ تلوار اور بوسیفوس کی روایات اگر صحیح ہیں تو حضرت موسیٰ نے ان پیدائشی قابلیتوں کے علاوہ فرعون کے ہاں علوم و فنون اور حکمرانی و سپہ سالاری کی وہ پوری تعلیم و تربیت بھی حاصل کی تھی جو شاہی خاندان کے افراد کو دی جاتی تھی۔ اور زمانہ شاہزادگی میں حبش کی مہم پر جا کر وہ اپنے آپ کو ایک بہترین جنرل بھی ثابت کر چکے تھے۔ پھر جو تھوڑی بہت کمزوریاں شاہی محلوں میں پرورش پانے اور فرعونی نظام کے اندر امارت کے مناصب پر سرفراز رہنے کی وجہ سے ان میں پائی جاتی تھیں، وہ بھی آٹھ دس سال عذرا کے علاقہ میں صحرائی زندگی گزارنے اور بکریاں چرانے کی بدولت دور ہو چکی تھیں اور اب فرعونی دربار کے سامنے ایک ایسا نرسیدہ و سنجیدہ حقیر کشور گیر نبوت کا دعویٰ لیے ہوئے کھڑا تھا جس کی بات کو بہر حال باور ہوائی سمجھ کر اڑایا نہ جاسکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عصا اور ید بیضاء کی نشانیاں دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری سخت مرعوب ہو چکے تھے اور ان کو تقریباً یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص فی الواقع کوئی فوق الفطری طاقت نہ اپنی پشت پر رکھتا ہے۔ ان کا حضرت موسیٰ کو ایک طرف جادوگر بھی کہتا اور پھر دوسری طرف یہ اندیشہ بھی ظاہر کرنا کہ یہ ہم کو اس سر زمین کی فرماں روائی سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، ایک صریح انصاف بیان تھا اور اس بوجھلاہٹ کا ثبوت تھا جو ان پر نبوت کے اس اولین مظاہرے سے طاری ہو گئی تھی۔ اگر حقیقت میں وہ حضرت موسیٰ کو جادوگر سمجھتے تو ہرگز ان سے کسی سیاسی انقلاب کا اندیشہ نہ کرتے۔ کیونکہ جادو کے بل بوتے پر کبھی دنیا میں کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہوا ہے۔

عَلَيْهِمْ ۝۱۱۲ وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ
 الْغَالِبِينَ ۝۱۱۳ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝۱۱۴ قَالُوا يَا مُوسَى إِنَّمَا
 أَن تُلْفَى وَإِنَّمَا أَن نَكُونُ نَحْنُ الْمُلْقِينَ ۝۱۱۵ قَالَ أَلْقُوا فَلَمَّا
 أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ
 عَظِيمٍ ۝۱۱۶ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَن ألقِ عَصَاكَ فَإِذَا هِيَ

پاس لے آئیں چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔

انہوں نے کہا ”اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟“

فرعون نے جواب دیا ”ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہو گے۔“

پھر انہوں نے موسیٰ سے کہا ”تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟“

موسیٰ نے جواب دیا ”تم ہی پھینکو۔“

انہوں نے جو اپنے آنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑی

زبردست جادو بنا لائے۔

ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے

۵۸۹ فرعونی درباریوں کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں خدائی نشان اور جادو کے امتیازی

فرق کا تصور بالکل واضح طور پر موجود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدائی نشان سے حقیقی تغیر واقع ہوتا ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو متاثر

کر کے اشیاء میں ایک خاص طرح کا تغیر محسوس کراتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حضرت موسیٰ کے دعوائے رسالت کو رد کرنے

کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے، یعنی عھا حقیقت میں سانپ نہیں بن گیا کہ اسے خدائی نشان مانا جائے، بلکہ صرف ہمیں ایسا

نظر آیا کہ وہ گویا سانپ تھا جیسا کہ ہر جادوگر کہتا ہے۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلا لیا جائے

اور ان کے ذریعہ سے لاکھوں اور رستیوں کو سانپوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دکھا دیا جائے تاکہ عامۃ الناس کے دلوں میں اس

پیغمبرانہ مجازے سے جو سبب بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکل دور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے۔



تَلَقَّفْ مَا يَأْفِكُونَ ﴿١١٤﴾ فَوَقَّعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٨﴾
 فَغَلِبُوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَبِيرِينَ ﴿١١٩﴾ وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ
 سِجْدِينَ ﴿١٢٠﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوسَى وَ
 هَارُونَ ﴿١٢٢﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ أَمُنْتُ بِهٖ قَبْلَ أَنْ أَدْنٰ لَكُمْ ۗ إِنَّ
 هَذَا الْمَكْرَ مَكْرٌ مُّمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا

اس جھوٹے طلسم کو نگلنا چلا گیا۔

اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔

فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) اُلٹے ذلیل ہو گئے۔ اور جادو گروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے ”ہم نے مان لیا رب العالمین کو اُس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔“

فرعون نے کہا ”تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً یہ کوئی

خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس اراستلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔“

۹۸ یہ گمان کرنا کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا ان لالچیوں اور رسیوں کو بنگل گیا جو جادو گروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور

اُرد ہے بنی نظر آ رہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر ان کے اُس طلسمِ فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انہوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہونا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادو کا وہ اثر کا فوراً ہونا چلا

گیا جس کی بدولت لالچیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہرائی نظر آتی تھیں اور اس کی ایک ہی گردش میں جادو گروں کی ہر لالچی، لالچی اور ہر رستی، رستی بن کر رہ گئی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو طہ، حاشیہ ۲۲)۔

۹۹ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعونوں کی چال کو اٹا انہی پر پلٹ دیا۔ انہوں نے تمام ملک کے ماہر جادو گروں کو بلا کر

منظر عام پر اس لیے مظاہرہ کرایا تھا کہ عوام الناس کو حضرت موسیٰ کے جادو گر ہونے کا یقین دلائیں یا کم از کم شک ہی میں ڈال دیں۔

لیکن اس مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد خود ان کے اپنے بلائے ہوئے ماہرین فن نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ حضرت موسیٰ جو چیز

پیش کر رہے ہیں وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ یقیناً رب العالمین کی طاقت کا کرشمہ ہے جس کے آگے کسی جادو کا زور نہیں چل

فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۱۴۳﴾ لَأَقْطَعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَسْرُجُكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۴۴﴾ قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا
مُنْقَلِبُونَ ﴿۱۴۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا
لَمَّا جَاءَنَا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿۱۴۶﴾

اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔

انہوں نے جواب دیا ”بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا۔ اسے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔“

سکتا۔ ظاہر ہے کہ جادو کو خود جادوگروں سے بڑھ کر اندر کون جان سکتا تھا۔ پس جب انہوں نے عملی تجربے اور آزمائش کے بعد شہادت دے دی کہ یہ چیز جادو نہیں ہے، تو پھر فرعون اور اس کے درباریوں کے لیے باشندگان ملک کو یہ یقین دلانا بالکل ناممکن ہو گیا کہ مروجی محض ایک جادوگر ہے۔

۹۲ فرعون نے پانسہ پلٹے دیکھ کر آخری چال یہ چلی تھی کہ اس سارے معاملہ کو موسیٰ اور جادوگروں کی سازش قرار دیدے اور پھر جادوگروں کو جسمانی عذاب اور قتل کی دھمکی دے کر ان سے اپنے اس الزام کا اقبال کرا لے۔ لیکن یہ چال بھی الٹی پڑی۔ جادوگروں نے اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ ان کا موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر ایمان لانا کسی سازش کا نہیں بلکہ سچے اعترافِ حق کا نتیجہ تھا۔ اب اُس کے لیے کوئی چارہ کار اس کے سوا باقی نہ رہا کہ حق اور انصاف کا ڈھونگ جو وہ رچانا چاہتا تھا اسے چھوڑ کر صاف صاف ظلم و ستم شروع کر دے۔

اس مقام پر یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ چند لمحوں کے اندر ایمان نے ان جادوگروں کی سیرت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہی جادوگروں کی دنائت کا یہ حال تھا کہ اپنے دینِ آباء کی نصرت و حمایت کے لیے گھروں سے چل کر آئے تھے اور فرعون سے پوچھ رہے تھے کہ اگر ہم نے اپنے مذہب کو موسیٰ کے حملہ سے بچا لیا تو سرکار سے ہمیں انعام تو

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَنْتَ مُوسَى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا
 فِي الْأَرْضِ وَيَذُرْكُمُ وَاللَّهِتُ قَالَ سَنُقْتِلُ أَبْنَاءَهُمْ وَ
 نَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٤﴾ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ
 اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ
 يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٥﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ
 قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسَى رَبُّكُمْ

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا ”کیا تو موسیٰ اور اُس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلے اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے؟“ فرعون نے جواب دیا ”میں اُن کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔“

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ”اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری کامیابی انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔“ اس کی قوم کے لوگوں نے کہا ”تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا ”قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب

لے گا، یاد ہو نعمت ایمان نصیب ہوئی تو انہی کی حق پرستی اور اولوالعزمی اس حد کو پہنچ گئی کہ تھوڑی دیر پہلے جس بادشاہ کے آگے لالچ کے مارے پچھے جا رہے تھے اب اس کی کبریائی اور اس کے جبروت کو ٹھوکر مار رہے ہیں اور اُن بدترین سزاؤں کو بھگتتے کے لیے تیار ہیں جن کی دھمکی وہ دے رہا ہے مگر اس حق کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کی صداقت ان پر کھل چکی ہے۔

۵۹۳ واضح رہے کہ ایک دورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے رعمیس ثانی کے زمانہ میں جاری ہوا تھا، اور

دورِ ستم یہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل

أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ
 تَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصِ
 مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٤٠﴾ فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا
 لِنَآهِذِهِ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَى وَمَنْ مَعَهُ إِلَّا
 إِنَّمَا طَّيَّرَهُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٤١﴾ وَقَالُوا
 مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِنَسْحَرَنَّ بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٤٢﴾

تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ ع
 ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے
 مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے
 ساتھیوں کو اپنے لیے فال بد ٹھہراتے حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں اکثر بے علم
 تھے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ تو ہمیں مسح کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

کرایا گیا اور ان کی بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ غالباً
 اسی دور کا ہے وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران میں ملا تھا اور جس میں یہی فرعون منفتح اپنے کارناموں اور
 فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کو بیچ تک باقی نہیں رہے (مذہب تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو المومن، آیت ۲۵)

۱۴۲ یہ اتھالی ہٹ زحری و سخن پروری تھی کہ فرعون کے اہل دربار اس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق
 وہ خود بھی بالیقین جانتے تھے کہ وہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ شاید کوئی بے وقوف آدمی بھی یہ باور نہ کرے گا کہ ایک پورے ملک میں
 قحط پڑ جانا اور زمین کی پیداوار میں مسلسل کمی واقع ہونا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید کہتا ہے کہ قَلَمًا جَاءَتْهُمْ
 آيُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (النمل۔ آیات
 ۱۳-۱۴) یعنی ”جب ہماری نشانیاں علانیہ ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر
 سے قائل ہو چکے تھے، مگر انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی راہ سے ان کا انکار کیا۔“

فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالِدَّمَ
 آيَةً مُفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا فَجُورِينَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ
 عَلَيْهِمُ الرَّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ
 لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرَّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي
 إِسْرَائِيلَ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرَّجْزَ إِلَىٰ آجِلٍ هُمْ
 يُلْفُوهُ إِذَا هُمْ يَبْكُونَ ﴿١٣٥﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ
 فِي الْيَمِّ يَأْتُهُمُ كَذِبًا وَأَيَّتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٣٦﴾

آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکلے اور خون برسیا یا
 یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔
 جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ، تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے
 اس کی بنا پر تمہارے حق میں دعا کر، اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا مٹو اور تو ہم تیری بات مان لیں گے اور
 بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔" مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے پے
 جس کو وہ بہر حال پہنچنے والے تھے، ہٹا لیتے تو وہ کھینٹ اپنے عہد سے پھر جاتے تب ہم نے ان سے انتقام
 لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہونے شروع

۹۵ غاب بارش کا طوفان مراد ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن

بائبل میں نزالہ باری کے طوفان کا ہی ذکر ہے اس لیے ہم اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

۹۶ اصل میں لفظ قُمَّل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ جُور، چھوٹی کھی، چھوٹی ٹڈی، پتھر، سرسری وغیرہ

غالباً یہ جامع لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جُوروں اور پتھروں نے آدمیوں پر اور سرسریوں (گھن کے ٹیڑوں) نے

غلام کے ذخیروں پر حملہ کیا ہوگا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائبل کی کتاب خروج، باب ۷ تا ۱۲ نیز الزخرف، حاشیہ ۲۳)۔

وَأَوْزَنَّا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۖ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٣٤﴾ وَجَوَّزْنَا
بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامِهِمْ
لَهُمْ قَالُوا يُمُوسَىٰ اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ

البرج

اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا گیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔

بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا، پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پران کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے، "اے موسیٰ، ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں"

۱۳۴ یعنی بنی اسرائیل کو فلسطین کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ بنی اسرائیل خود سرزمین مصر کے مالک بنا دیے گئے۔ لیکن اس معنی کو تسلیم کرنے کے لیے نہ تو قرآن کریم کے اشارات کافی واضح ہیں اور نہ تاریخ و آثار ہی سے اس کی کوئی قوی شہادت ملتی ہے، اس لیے اس معنی کو تسلیم کرنے میں ہمیں متامل ہے۔ ملاحظہ ہو الکہف جاثیہ ۷۰۔ الشعراء جاثیہ ۷۰

۱۳۵ بنی اسرائیل نے جس مقام سے بحر احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نماٹے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اُس زمانے میں جزیرہ نماٹے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابو الزنیمہ کے درمیان تانبے اور فروزے کی کانیں تھیں جن سے اہل مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر

قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾ إِنَّ هَؤُلَاءِ مَتَّبِعُوا مَا هُمْ
فِيهِ وَابْتُلُوا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ أَغْيِرَ اللَّهُ
أَبْغِيكُمْ إِلَهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَ

موسیٰ نے کہا ”تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے
والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔“ پھر موسیٰ نے کہا ”کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود مانتا
ہیے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔ اور اللہ فرماتا ہے“

چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی منفقہ کے مقام پر تھی جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس
کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوب مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی
قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو، جن پر مصریوں کی غلامی نے
مصریت زدگی کا اچھا خاصا گہرا ٹھپا لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

بنی اسرائیل کی ذہنیت کو اہل مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے باآسانی کیا جاسکتا ہے
کہ مصر سے نکل آنے کے ۷۰ برس بعد حضرت موسیٰ کے خلیفہ اول حضرت یوشع بن نون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمع عام سے
خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عظم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو اور ان دیوتاؤں کو دور کر دو

جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے اور خداوند کی پرستش کرو۔ اور اگر

خداوند کی پرستش تم کو بری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اسے جس کی پرستش کرو گے چن لو۔۔۔۔۔۔ اب

رہی میری اور میرے گھرانے کی بات سو ہم تو خداوند ہی کی پرستش کریں گے“ (دیشوع ۲۳: ۱۳-۱۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یوشع کی تربیت و رہنمائی میں زندگی بسر

کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے ان اثرات کو نہ نکال سکی جو فرعون نے مصر کی بندگی کے دور میں اُس کی رگ رگ کے اندر از گئے

تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بت کدہ سامنے آگیا تھا اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں

میں سے بہتوں کی پشائیاں اُس آستانے پر سجدہ کرنے کے لیے بیتاب نہ ہو جاتیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو مانتا

رکھتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔

إِذْ أَخْبَيْنَاكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُم بِسُوءِ الْعَذَابِ
يُقْتَلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ
مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۳۱﴾ وَوَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً
وَأَتَمَّمْنَاهَا بِعَشْرِ سَرِيَّاتٍ سَرِيَّةٍ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً وَقَالَ

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ ع

ہم نے موسیٰ کو تیس شب روز کے لیے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔ موسیٰ نے چلتے ہوئے اپنے

۱۳۱ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہو گئیں اور انہیں ایک مختار قوم کی حیثیت حاصل ہو گئی تو حکیم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ کوہ سینا پر طلب کیے گئے تاکہ انہیں بنی اسرائیل کے لیے شریعت عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ یہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس سلسلہ کی پہلی طلبی تھی اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰ ایک پورا چاند پہاڑ پر گزریں اور روز سے رکھ کر، شب و روز عبادت اور تفکر و تدبیر کے اور دل و دماغ کو یکسو کرنے اس قولِ تعقل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اس مقام پر چھوڑا تھا جو موجودہ نقشہ میں نبی صالح اور کوہ سینا کے درمیان وادی ایشخ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحمہ کہلاتا ہے۔ وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالح علیہ السلام نمود کے علاقے سے ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے۔ آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبل ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہو کر جا بیٹھے تھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھنکار ہوتا ہے اور جس کی بلندی ۷۲۵۹ فٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ نے چلہ کیا

مُوسَىٰ لِإِخِيهِ هَارُونَ أَخْلَفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ
 سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۳۲﴾ وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ
 رَبُّهُ قَالَ سَرِبَ أَرِنِي أَنظُرَ إِلَيْكَ ۗ قَالَ لَنْ تَرِنِي وَلَكِن
 أَنظُرَ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرِنِي ۗ فَلَمَّا
 تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۗ فَلَمَّا
 أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۳﴾
 قَالَ يَمُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَتِي ۖ وَ

بھائی ہارون سے کہا کہ ”میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ
 پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا“ جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے
 اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ ”اے رب، مجھے یا رائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں“ فرمایا
 تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ
 تو مجھے دیکھ سکے گا“ چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر
 گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا ”پاک ہے تیری ذات“ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان
 لانے والا میں ہوں“ فرمایا ”اے موسیٰ، میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کو

تھا۔ اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا ایک گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جسٹین کے زمانہ کی ایک
 خانقاہ آج تک موجود ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو النمل، حواشی ۹-۱۰)۔

۱۳۲ حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ حضرت موسیٰ سے تین سال بڑے تھے لیکن کارِ نبوت میں حضرت موسیٰ کے ماتحت
 اور مددگار تھے۔ ان کی نبوت مستقل نہ تھی بلکہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کر کے ان کو اپنے وزیر کی حیثیت سے مانگا
 تھا جیسا کہ آگے چل کر قرآن مجید میں تبصریح بیان ہوا ہے۔

بِكَلَامِي ۞ فَخُذْ مَا آتَيْتَكَ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۞ (۱۳۴) وَكَتَبْنَا
لَهُ فِي الْأَلْوَابِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ ۞
فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَا خُدَاوَا بِأَحْسَنِهَا سَأُرِيكُمْ
دَارَ الْفَاسِقِينَ ۞ (۱۳۵) سَأَصْرِفُ عَنْ آيَتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ
فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۞ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا

اور مجھ سے ہم کلام ہو پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجالا۔

اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح

ہدایت تختیوں پر لکھ کر دی اور اس سے کہا:

”ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی

پیروی کریں۔ عتقرب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔ اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی

نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھیں کبھی اس پر ایمان

۱۔ بائبل میں تصریح ہے کہ یہ دونوں تختیاں پتھر کی سلیں تھیں، اور ان تختیوں پر لکھنے کا نسل بائبل اور قرآن دونوں

میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم اس بات کا تعین کر سکیں کہ آیا ان تختیوں پر

کتابت کا کام اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنی قدرت سے کیا تھا، یا کسی فرشتے سے یہ خدمت لی تھی، یا خود حضرت موسیٰ کا ہاتھ

استعمال فرمایا تھا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائبل، کتاب خروج، باب ۳۱، آیت ۱۸-۱۹، آیت ۱۵-۱۶، استثناء، باب ۵

آیت ۶-۲۲)

۲۔ یعنی احکام الہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم لیں جو عقل عام سے ہر وہ شخص سمجھ لے گا جس کی نیت میں فساد یا

جس کے دل میں ٹیڑھ نہ ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی گئی کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادھے الفاظ میں سے قانونی ایجنج اور حیلوں

کے راستے اور فتنوں کی گنجائشیں نکالتے ہیں، کہیں ان کی موٹنگانیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے۔

۳۔ یعنی آگے چل کر تم لوگ ان قوموں کے آثارِ قدیمہ پر سے گزرو گے جنہوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا

اور غلط روی پر اصرار کیا۔ ان آثار کو دیکھ کر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ایسی روش اختیار کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

بِهَاءٍ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الشُّرْكِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ
 يَرَوْا سَبِيلَ الْغَىِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
 وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿۱۳۶﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ
 حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۷﴾

نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ
 نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے
 بے پروائی کرتے رہے ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی عیشی کا انکار کیا اس کے
 سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟

۱۳۶ یعنی میرا قانون فطرت ہی ہے کہ ایسے لوگ کسی عبرت ناک چیز سے عبرت اور کسی سبق آموز شے سے سبق حاصل

نہیں کر سکتے۔

بڑا بڑا "یا تکبر کرنا" قرآن مجید اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھنے لگے اور
 خدا کے احکام کی کچھ پروا نہ کرے، اور ایسا طرز عمل اختیار کرے گویا کہ وہ نہ خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اس کا رب ہے۔ اس خود سری
 کی کوئی حقیقت ایک پندار غلط کے سوا نہیں ہے، کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے ایک بندے کو کسی طرح یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ
 غیر کا بندہ بن کر رہے۔ اسی لیے فرمایا کہ وہ بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔

۱۳۷ ضائع ہو گئے، یعنی بار آور نہ ہوئے، غیر مفید اور لا حاصل نکلے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں انسانی سعی و عمل کے

بار آور ہونے کا انحصار بالکل دو امور پر ہے۔ ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانون شرعی کی پابندی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل
 میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر ہے۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی وہاں لازماً جبط عمل واقع ہوگا۔ جس نے خدا سے
 ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دنیا میں کام کیا، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار
 نہیں ہو سکتا۔ اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا، اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا، کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ
 پانے کی امید نہ رکھنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مسلوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشاء کے
 خلاف تصرف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حق دار ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ
 قبضہ کے زمانہ میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادہ کے ساتھ کیا ہو کہ جب تک اصل مالک اس کی جرات بے جا سے اغماض کر رہا

وَ اتَّخَذَ قَوْمَ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُلِيَّتِهِمْ عَجَلًا جَسَدًا لَّهُ
 خَوَارٌ ۗ لَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۚ
 اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا
 أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا ۗ قَالُوا لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا
 لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۱۳۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ

موسیٰ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیورٹوں سے ایک گچھڑے کا پتلا بنایا جس میں سے
 بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انہیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا
 ہے، مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنایا اور وہ سخت ظالم تھے۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا ظلم
 ٹوٹ گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ ”اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم
 نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔“ ادھر سے موسیٰ غصے درنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کی

ہے، اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا اور مالک کے قبضہ میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا
 طالب نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں اس غاصب کی اپنی زمین واپس لینے کے بعد زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصہ خواہ مخواہ اسے دوں؟
 ۱۳۸ یعنی ان چالیس دنوں کے دوران میں جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طلسمی پرکھ سینا گئے ہوئے تھے
 اور یہ قوم پہاڑ کے نیچے میدان الراعہ میں ٹھہری ہوئی تھی۔

۱۳۹ یہ اُس مہریت زدگی کا دوسرا ظہور تھا جسے بے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور
 تقدیس کا جو رواج تھا اس سے یہ قوم اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہو چکی تھی کہ قرآن کہتا ہے وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ ۗ یعنی ان
 کے دلوں میں گچھڑا بس کر رہ گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے
 تھے۔ سمندر کا پھٹنا، فرعون کا مفرق ہونا، ان لوگوں کا بخیریت اُس بندِ غلامی سے نکل آنا جس کے ٹرنے کی کوئی امید نہ تھی، اور اس
 سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے، اور انہیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کی قدرت سے ہوا ہے، کسی
 دوسرے کی طاقت و تصرف کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ مگر اس پر بھی انہوں نے پہلے تو پیغمبر سے ایک مصنوعی خدا طلب کیا، اور پھر
 پیغمبر کے پیٹھ ٹوڑتے ہی خود ایک مصنوعی خدا بنا ڈالا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر بعض انبیاء و بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو اُس بدکار عورت

غَضَبَانَ اسِفًا قَالَ بِسْمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي اَعْجَلْتُمْ
 اَمْرًا رَيْكُمُ وَالْقَى الْاَلْوَا حَ وَاخَذَ بِرَاسِ اَخِيهِ يَجْرَهُ اِلَيْهِ
 قَالَ ابْنُ اَمْرَانَ الْقَوْمَ اسْتَضَعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي
 فَلَا تُشْمِتْ بِي الْاَعْدَاءَ وَاِنَّ تَجْعَلَنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۱۵﴾

طرف پلٹا۔ آتے ہی اس نے کہا ”بہت بُری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے؟“ اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔ ہارون نے کہا ”اے میری ماں کے بیٹے، ان لوگوں نے مجھے دبایا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر“

سے تشبیہ دی ہے جو اپنے شوہر کے سوا ہر دوسرے مرد سے دل لگاتی ہو اور جو شب اول میں بھی بے وفائی سے نہ چمکی ہو۔

۱۵۔ یہاں قرآن مجید نے ایک بہت بڑے الزام سے حضرت ہارون کی براءت ثابت کی ہے جو یہودیوں نے زبردستی ان پر چسپاں کر رکھا تھا۔ بائبل میں پچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کو پہاڑ سے اترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارون سے کہا کہ ہمارے لیے ایک معبود بنا دو، اور حضرت ہارون نے ان کی فرمائش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اٹھے کہ اے اسرائیل، یہی تیرا وہ خدا ہے جو تجھے ملک مصر سے نکال کر لایا ہے۔ پھر حضرت ہارون نے اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے آگے قربانیاں چڑھائیں (خروج - باب ۳۲ - آیت ۱-۴)۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بصراحت اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقت واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرم عظیم کا مرتکب خدا کا نبی ہارون نہیں بلکہ خدا کا باغی سامری تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ طہ، آیات ۹۰-۹۴)۔

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انہوں نے داغدار کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے، اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں، مثلاً شرک، جادوگری، زنا، جھوٹ، دغا بازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت عجیب ہے لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب اخلاقی و

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَإِلَىٰ خِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ
 أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿١٥١﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيِّئًا لَّهُمْ
 غَضَبٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي
 الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا
 وَأَمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾ وَلَمَّا
 سَكَتَ عَن مُّوسَىٰ الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَابَ ﴿١٥٤﴾ وَفِي نُحُوتِهَا هُدًى

تب موسیٰ نے کہا ”اے رب، مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو
 سب بڑھ کر رحیم ہے۔“ (جواب میں ارشاد ہوا کہ) ”جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے
 رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو
 ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ بُرے عمل کریں پھر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس
 توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمائے والا ہے۔“

پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اٹھالیں جن کی تحریر میں ہدایت

مذہبی انحطاط میں مبتلا ہونے اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک کو چھٹی کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور
 بد اخلاقیوں کا سیلاب بہا لے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عذرات تراشنے شروع کیے اور اسی سلسلہ میں انہوں نے
 وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے، انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جاسکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے بچ سکے
 تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے بتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب اخلاقی انحطاط
 انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں، مینیوں اور اوتاروں کی، غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے
 ہو سکتے تھے ان سب کی زندگیوں بد اخلاقی کے تارکوں سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جاسکے کہ جب ایسی ایسی عظیم الشان ہستیاں
 ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان ان میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، اور پھر جب یہ افعال اتنے اونچے
 مرتبے والوں کے لیے بھی شرمناک نہیں ہیں تو ہمارے لیے کیوں ہوں۔

وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْتَابُونَ ﴿۱۵۲﴾ وَأَخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ أَتَهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا إِن هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ إِنَّتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اُس نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اُس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار، آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں پس ہمیں معاف کر دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔"

۱۵۹۔ یہ طلبی اس غرض کے لیے ہوئی تھی کہ قوم کے لئے نمائندے کوہ سینا پر پیشی خداوندی میں حاضر ہو کر قوم کی طرف سے گورنالہ پرستی کے جرم کی معافی مانگیں اور سزا سزا نوا طاعت کا عہد استوار کریں۔ بائبل اور تلمود میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ جو تختیاں حضرت موسیٰ نے پھینک کر توڑ دی تھیں ان کے بدلے دوسری تختیاں عطا کرنے کے لیے آپ کو سینا پر بلایا گیا تھا (خروج۔ باب ۳۲)۔

۱۶۰۔ مطلب یہ ہے کہ ہر آزمائش کا موقع انسانوں کے درمیان فیصلہ کن ہوتا ہے۔ وہ چھاج کی طرح ایک مخلوط گروہ میں سے کارآمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کو پھینک کر الگ کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا عین مفتضحیٰ ہے کہ ایسے مواقع وقتاً فوقتاً آتے رہیں۔ ان مواقع پر جو کامیابی کی راہ پاتا ہے وہ اللہ ہی کی توفیق و رہنمائی سے پاتا ہے اور جو ناکام ہوتا ہے وہ اُس کی توفیق و رہنمائی سے محروم ہونے کی بدولت ہی ناکام ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی طرف سے توفیق اور رہنمائی ملنے اور نہ ملنے کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے جو ہر امر حکمت اور عدل پر مبنی ہے، لیکن ہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ آدمی کا آزمائش کے

وَ اَكْتُبُ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ
 قَالَ عَدَاوِي اُصِيبُ بِهٖ مِنْ اَشْيَاءٍ وَ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ
 فَسَاكُنْهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ يُوْتُونَ الزَّكَاةَ وَ الَّذِينَ هُمْ
 بِاٰيٰتِنَا يُوْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الرَّحِيْمَ الَّذِي

اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی ہم نے آپ کی طرف رجوع
 کر لیا۔ جو اب میں ارشاد ہوا ”سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھانی
 ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے
 اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔“

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں جس کا

موقع پر کامیابی کی راہ پانا یا نہ پانا اللہ کی توفیق و ہدایت پر منحصر ہے۔

اللہ یعنی اللہ تعالیٰ جس طریقے پر خدائی کر رہا ہے اس میں اصل چیز غضب نہیں ہے جس میں کبھی کبھی رحم اور فضل کی شان
 نمودار ہو جاتی ہو، بلکہ اصل چیز رحم ہے جس پر سارا نظام عالم قائم ہے اور اس میں غضب صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب
 بندوں کا تردد حد سے فزوں ہو جاتا ہے۔

اللہ حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب اوپر کے فقرے پر ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اب موقع کی مناسبت سے فوراً
 بنی اسرائیل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے لیے جو شرائط
 موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عائد کی گئی تھیں وہی آج تک قائم ہیں اور دراصل یہ انہی شرائط کا تقاضا ہے کہ تم اس پیغمبر پر ایمان لاؤ۔
 تم سے کہا گیا تھا کہ خدا کی رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے جو نافرمانی سے پرہیز کریں۔ تو آج سب سے بڑی بنیادی نافرمانی یہ ہے کہ جس پیغمبر
 کو خدا نے مامور کیا ہے اس کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے۔ لہذا جب تک اس نافرمانی سے پرہیز نہ کر دو گے تقویٰ کی جڑ
 ہی سرے سے قائم نہ ہوگی خواہ جزئیات و فروعات میں تم کتنا ہی تقویٰ بگھارتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رحمت الہی سے حصہ پانے
 کے لیے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے۔ تو آج کسی انفاق مال پر اس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آسکتی جب تک
 اقامت دین حق کی اس جہد و جدوجہد کا ساتھ نہ دیا جائے جو اس پیغمبر کی قیادت میں ہو رہی ہے۔ لہذا جب تک اس راہ میں مال صرف نہ

يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَا أُولَئِكَ
 بِالْمَعْرُوفِ وَبَيْنَهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحْرِمُهُمُ
 الْعَنِيبَاتِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْإِغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے
 روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ
 اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھوتتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

کو گے زکوٰۃ کی بنیاد ہی استوار نہ ہوگی چاہے تم کتنی ہی خیرات اور نذر دینا کرتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت صرف
 ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں۔ تو آج جو آیات اس پیغمبر پر نازل ہو رہی ہیں ان کا انکار کر کے تم کسی
 طرح بھی آیاتِ الہی کے ماننے والے قرار نہیں پاسکتے۔ لہذا جب تک ان پر ایمان نہ لائے گے یہ آخری شرط بھی پوری نہ ہوگی خواہ
 تورات پر ایمان رکھنے کا تم کتنا ہی دعویٰ کرتے رہو۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اُمّی کا لفظ بہت معنی خیز استعمال ہوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری قوموں کو
 اُمّی (Gentiles) کہتے تھے اور ان کا قومی فخر و غرور کسی اُمّی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار، اس پر بھی تیار نہ تھا کہ اُمّیوں کے
 لیے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن ہی میں آتا ہے کہ وہ کہتے تھے لَيْسَ عَلَيْكَ فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلُ آلِ
 عِمْرَانَ آیت ۷۵) اُمّیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا
 ہے کہ اب تو اسی اُمّی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے، اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی
 غضب تمہارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔

اللہ مثال کے طور پر تورات اور انجیل کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق صاف
 اشارات موجود ہیں: استثناء، باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹-متی، باب ۲۱، آیت ۲۳ تا ۲۶-یوحنا، باب ۱، آیت ۱۹ تا ۲۱-یوحنا
 باب ۱۳، آیت ۱۵ تا ۱۷ اور آیت ۲۵ تا ۳۰-یوحنا، باب ۱۵، آیت ۲۵-۲۶-یوحنا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔

اللہ یعنی جن پاک چیزوں کو انہوں نے حرام کر رکھا ہے، وہ انہیں حلال قرار دیتا ہے اور جن ناپاک چیزوں کو یہ لوگ
 حلال کیے بیٹھے ہیں انہیں وہ حرام قرار دیتا ہے۔

اللہ یعنی ان کے نیکوں نے اپنی قانونی موٹنگائیوں سے، ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے توبہ کے مبالغوں سے،
 اور ان کے جاہل عوام نے اپنے توہمات اور خود ساختہ حدود و ضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا ہے اور جن جکڑ بندوں

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ
 مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٥٤﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولٌ
 اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ
 إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الَّذِي
 يَأْتِيكُمْ بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٥﴾ وَ
 مِنْ قَوْمِ مُوسَى أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٦﴾

لہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار
 کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اے محمدؐ، کہو کہ ”اے انسانو،
 میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا
 کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور
 اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی،
 امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔“

موسیٰؑ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔

میں کس رکھا ہے، یہ پیغمبر وہ سارے بوجھاتا رہتا ہے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزاد کر دیتا ہے۔

اللہ اصل سلسلہ کلام بنی اسرائیل سے متعلق چل رہا تھا۔ بیچ میں موقع کی مناسبت سے رسالتِ محمدی پر ایمان

لانے کی دعوت بطور جملہ مقررہ آگئی۔ اب پھر تقریر کا رخ اسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو پچھلے کئی رکوعوں سے بیان ہو رہا ہے۔

اللہ بیشتر مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق ہدایت

اور انصاف کرتا ہے، یعنی ان کے نزدیک اس آیت میں بنی اسرائیل کی وہ اخلاق و فہمی حالت بیان کی گئی ہے جو نزولِ قرآن کے

وقت تھی۔ لیکن سیاق و سباق پر نظر کرتے ہوئے ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہ حال بیان

وَقَطَعْنَهُمْ اثْنَيْ عَشَرَ نَبِطًا وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمَهُ أَنْ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّٰنَ وَالسَّلْوَىٰ كُلُّوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا

اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی۔ اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا۔ کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے

جو ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں تھا، اور اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب اس قوم میں گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا گیا اور حضرت حق کی طرف سے اس پر گرفت ہوئی تو اس وقت ساری قوم بگڑی ہوئی نہ تھی بلکہ اس میں ایک اچھا خاصا صالح عنصر موجود تھا۔
۱۱۸ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اس تنظیم کی طرف جو سورہ ماائدہ آیت ۱۲ میں بیان ہوئی ہے اور جس کی پوری تفصیل بائبل کی کتاب گنتی میں ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی، پھر ان کے ۱۲ گھرانوں کو جو حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظم کیا، اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدنی و معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکام شریعت کا اجراء کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوب کے بارہویں بیٹے لاوی کی اولاد کو جس کی نسل سے حضرت موسیٰ اور ہارون تھے، ایک الگ جماعت کی شکل میں منظم کیا تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمع حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے۔

۱۱۹ اور جس تنظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھلا ان احسانات کے تھی جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ اس کے بعد اب مزید تین احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ نمائے سینا کے بیابانی علاقہ میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان کو دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل چھا دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام من و سلویٰ کے نزول کی شکل میں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر ان تین اہم ترین ضروریات زندگی کا بند نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی، اس علاقہ میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔ آج بھی کوئی

سَزَيْدِكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٦٠﴾
 وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
 وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ
 سَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا

تم کو بخشتی ہیں۔ مگر اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے۔
 یاد کرو وہ وقت جب ان سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے
 اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز
 ہوتے ہوئے داخل ہو، ہم تمہاری خطا میں معاف کریں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید
 فضل سے نوازیں گے۔ مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اُس بات کو جو ان سے

شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ بیکایک آٹھیرے تو
 اس کے لیے پانی، خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے
 زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں پانچ چھ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے ٹرپوں
 کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردمسرا لائق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے بہت سے محققین نے، جو نہ کتاب کو
 مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نما کے سینا کے اُس حصے سے
 گزرے ہونگے جس کا ذکر بائبل اور قرآن میں ہوا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے
 شمالی حصے میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نما کے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابل
 تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکی تھی، خصوصاً جب کہ بصر کی طرف سے اس کی رسد
 کا راستہ بھی منقطع تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔
 ان امور کو پیش نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن
 احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم
 کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غلامیوں کی ترکیب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری
 پڑی ہے۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، حواشی نمبر ۷۲، ۷۳، ۷۴)

غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سُرُجًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا
كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٦٢﴾ وَسَأَلَهُمُ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ
الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ
سَبْتِهِمْ شُرْعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ

کسی گئی تھی بدل ڈالا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا ^{۱۶۱}
اور ذرا ان سے اُس سبتی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ
واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت
ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے

ﷺ اب تاریخ بنی اسرائیل کے ان واقعات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ
بالا احسانات کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مہربانہ بے باکیوں کے ساتھ دیتے رہے اور پھر کس طرح مسلسل تباہی کے گڑھے میں گرتے
چلے گئے۔

ﷺ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، حاشیہ ۷۷۷ و ۷۷۸۔

ﷺ محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست
نے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحر قلزم
کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت
میں نظر آتی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانہ خروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمان نے اپنے بحر قلزم کے جنگی و تجارتی
بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔

جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کی کتب مقدسہ میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور ان کی
تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں، مگر قرآن مجید میں جس انداز سے اس واقعہ کو یہاں اور سورہ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے اس
سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے دور میں بنی اسرائیل بالعموم اس واقعہ سے خوب واقف تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ
مدینہ کے یہودیوں نے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، قرآن کے اس بیان پر قطعاً
کوئی اعتراض نہیں کیا۔

نَبَلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٣﴾ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا لَّا يَهْتَدُونَ اللَّهُ مَهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعذِرَةٌ إِلَىٰ سَائِرِكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا

ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔ اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ”ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس اُمید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔“ آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو

﴿١٦٣﴾ ”سبت“ ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولاد اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی ذمیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یرمیاہ نبی کے زمانہ میں (جو ۶۲۸ء اور ۵۸۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پچھانگوں سے لوگ سبت کے دن مال اسباب لے لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش کر دیا جائے گا (یرمیاہ ۱۷: ۲۱-۲۴)۔ اسی کی شکایت حزقی ایل نبی بھی کرتے ہیں جن کا دور ۵۹۵ء اور ۵۳۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرا ہے، چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حزقی ایل ۲۰: ۱۲-۲۴)۔ ان حوالوں سے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہے وہ بھی غالباً اسی دور کا واقعہ ہوگا۔

﴿١٦٤﴾ اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے لیے جو طریقے اختیار فرماتا ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب میلان بڑھنے لگتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغ دار کرنا چاہتا ہے ان سے وہ صرف اس لیے باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اُسے نہ مل

ذِكْرُوا بِهِ ابْنَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَاخَذْنَا
الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَیِّنٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۱۶۵﴾
فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً

انہیں یاد کرانی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو بُرائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں
کو جو ظالم تھے ان کی نام نہرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے
ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا کہ بت رہو جاؤ
رہے ہوں۔

۱۶۵ اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک وہ جو دھڑتے سے احکام الہی کی خلاف
ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے
تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ جن کی غیرت ایمانی حدود اللہ
کی اس حکم کھلابے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید
وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہ راست پر آجائیں اور اگر وہ راہ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا
فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی براءت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورت حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو
قرآن مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچا گیا کیونکہ اسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش
کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ
اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات
پانے کی تصریح کی ہے، لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے لہذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نجات پانے
والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ وہ
پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا، بعد میں ان کے شاگرد و بزرگ نے
ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا
ہے کہ حضرت ابن عباس کا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں
میں تقسیم ہو سکتی ہے، ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق
بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا، تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی

خَسِيبٍ ﴿۱۶۶﴾ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيُبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ
مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۝

۱۶۶
ذریل اور خوار۔

اور یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ ”وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل
پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے“ یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے

تائید معذرتہ الیٰ سآتکم کے فقرے سے بھی ہوتی ہے جس کی توشیح بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے۔
اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں غلابیہ احکام الہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی
ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بڑی نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی، بلکہ اُسے خدا
کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہو گا کہ وہ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اقامت
حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم
کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ
خَاصَّةً وَذُرُوعًا مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم مِّنْهُم
ظلم کیا ہو۔ اور اس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتی
یرد المنکرین ظہرانہم وہم قادرون علیٰ ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلك عذب اللہ
المخاصة والعامة، یعنی اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت
نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضگی کرنے پر قادر ہوں
اور پھر کوئی اظہار ناراضگی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔
مزید برآں جو آیات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں
میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بیسیس (سخت عذاب) فرمایا گیا ہے، اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار
کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے، اور دوسری قسط کا
عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔ ان اصبت فمن اللہ وان اخطت فمن نفسی،
واللہ غفورٌ رحیم۔

۱۶۶ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ، حاشیہ نمبر ۸۳۔

۱۶۷ اصل میں لفظ تَأَذَّن استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو نوٹس دینے یا خبردار کر دینے کا ہے۔

وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۷﴾ وَقَطَّعْنَهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَّمًا مِّنْهُمْ
الضَّالِّحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ وَبَلَوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ
وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۲۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ
وَوَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ
سَيَغْفِرُ لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلَهُ يَأْخُذُوهُ

اور تقیاً وہ درگزر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔

ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں
نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور بُرے حالات سے آزمائش میں مبتلا
کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے
جو کتاب الہی کے وارث ہو کر اسی دنیا ئے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے
ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع دنیا پھر سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔^{۱۲۹}

۱۲۸ء یہ تنبیہ بنی اسرائیل کو تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہودیوں کے مجموعہ کتب مقدسہ
میں یسعیاہ اور یرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی تمام کتابیں اسی تنبیہ پر مشتمل ہیں پھر یہی تنبیہ مسیح علیہ السلام نے
انہیں کی جیسا کہ اناجیل میں ان کی متعدد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے اس کی توثیق کی۔ اب یہ بات قرآن اور اس
سے پہلے صحیفوں کی صداقت پر ایک بین شہادت ہے کہ اُس وقت سے لے کر آج تک تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے
جس میں یہودی قوم دنیا میں کہیں نہ کہیں روندی اور پامال نہ کی جاتی رہی ہو۔

۱۲۹ء یعنی گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر اس بھروسے پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی
طرح بخشش ہو ہی جائے گی کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور خواہ ہم کچھ ہی کریں بہر حال ہماری مغفرت ہونی ضروری ہے۔ اسی غلط فہمی کا
نتیجہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقع سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا
ہو جاتے ہیں۔ بد نصیب لوگ! اُس کتاب کے وارث ہوئے جو ان کو دنیا کا امام بنانے والی تھی، مگر ان کی کم ظرفی اور لپست خیالی نے اس
نسخہ کیمیا کر لے کر دنیا کی متاع حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل و راستی کے علمبردار

أَلَمْ يُوْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
 إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَالذَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ
 يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦٩﴾ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَ
 أَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٧٠﴾ وَإِذْ
 نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو، اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لیے ہی بہتر ہے، کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟ جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم رکھی ہے، یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔ انہیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جبکہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آپڑے گا اور اس وقت

اور خیر و صلاح کے رہنما بنتے، محض دنیا کے گتے بن کر رہ گئے۔

۱۶۹ یعنی یہ خود جانتے ہیں کہ توراہ میں کہیں بھی بنی اسرائیل کے لیے نجات کے غیر مشروط پر دانے کا ذکر نہیں ہے۔ نہ خدا نے کبھی ان سے یہ کہا اور نہ ان کے پیغمبروں نے کبھی ان کو یہ اطمینان دلایا کہ تم جو چاہو کرتے پھر دہر حال تمہاری مغفرت ضرور ہوگی۔ پھر آخر انہیں کیا حق ہے کہ خدا کی طرف وہ بات منسوب کریں جو خود خدا نے کبھی نہیں کہی حالانکہ ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ خدا کے نام سے کوئی بات خلاف حق نہ کہیں گے۔

۱۷۰ اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ خدا ترس لوگوں کے لیے تو آخرت کی قیام گاہ ہی بہتر ہے، پہلے ترجمہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مغفرت کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم کام تو وہ کرو جو سزا دینے کے لائق ہوں مگر تمہیں آخرت میں جگہ مل جائے اچھی، محض اس لیے کہ تم یہودی یا اسرائیلی ہو۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل موجود ہو تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ آخرت میں اچھا مقام صرف انہی لوگوں کو مل سکتا جو دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ کام کریں۔ رہا دوسرا ترجمہ تو اس کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ دنیا اور اس کے فائدوں کو آخرت پر ترجیح دینا تو صرف ان لوگوں کا کام ہے جو خدا ترس ہوں، خدا ترس لوگ تو لازماً دنیا کی مصلحتوں پر آخرت کی مصلحت

خُذُوا مَا آتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٤١﴾
 وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ
 أَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا ۗ

ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ لے لو اور جو کچھ
 اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، تو قہر سے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔

اور اے نبی، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی
 نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟"
 انہوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں"۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ

کو اور دنیا کے عیش پر آخرت کی بھلائی کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۳۲ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو موسیٰ علیہ السلام کو شہادت نامہ کی سنگین لوحیں عطا کیے جانے کے موقع پر کوہ سینا

کے دامن میں پیش آیا تھا۔ بائبل میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے بلائے اور وہ پہاڑ کے نیچے اکھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر

سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح

اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا" (خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کتاب کی پابندی کا عہد لیا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ان پر ایسا ماحول طاری

کر دیا جس سے انہیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اس کے عہد کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہوا اور وہ اس شہنشاہ

کائنات کے ساتھ میثاق استنواہ کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں۔ اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق

باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انہیں زبردستی خوف زدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب سب اہل ایمان تھے اور دامن

کوہ میں میثاق باندھنے ہی کے لیے گئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و قرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس

عہد و قرار کی اہمیت ان کو اچھی طرح محسوس کرادی جائے تاکہ اقرار کرتے وقت انہیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادر مطلق ہستی سے

اقرار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بد عہدی کرنے کا انجام کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر بنی اسرائیل سے خطاب ختم ہو جاتا ہے اور بعد کے رکوعوں میں تقریر کا رخ عام انسانوں کی طرف پھرتا ہے

جن میں خصوصیت کے ساتھ روئے سخن ان لوگوں کی جانب ہے جو براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے

۱۳۳ اور کاسلسلہ بیان اس بات پر ختم ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بندگی و اطاعت کا عہد لیا تھا۔ اب عام انسانوں کی طرف خطاب کر کے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، اور حقیقت تم سب اپنے خالق کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمہیں ایک روز جواب دہی کرنی ہے کہ تم نے اس میثاق کی کہاں تک پابندی کی۔

۱۳۴ جیسا کہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ تخلیق آدم کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسان اول کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا، اسی طرح پوری نسل آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابی بن کعب نے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

”اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور ایک ایک قسم یا ایک ایک دور کے لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انہیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انہیں آپ اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے عرض کیا ضرور آپ ہمارا رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھیراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔ میں تمہارے پاس اپنے وغیر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود“

اس معاملہ کو بعض لوگ محض تمثیلی انداز بیان پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہاں قرآن مجید صرف یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت کا اقرار انسانی فطرت میں پیوست ہے، اور اس بات کو یہاں ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا یہ ایک واقعہ تھا جو عالم خارجی میں پیش آیا۔ لیکن ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اسے بالکل ایک واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور صرف بیان واقعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے روز بنی آدم پر حجت قائم کرتے ہوئے اس اذی عہد و اقرار کو سنہرے میں پیش کیا جائے گا۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے محض ایک تمثیلی بیان قرار دیں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان تمام انسانوں کو جنہیں وہ قیامت تک پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، بیک وقت زندگی اور شعور اور گویائی عطا کر کے اپنے سامنے حاضر کیا تھا، اور فی الواقع انہیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی رب اور کوئی اللہ اس کی ذات اقدس و اعلیٰ کے سوا نہیں ہے، اور ان کے لیے کوئی صحیح طریق زندگی اس کی بندگی و فرماں برداری (اسلام) کے سوا نہیں ہے۔ اس اجتماع کو اگر کوئی شخص بیدار مکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرہ فکر کی تنگی کا نتیجہ ہے، اور نہ حقیقت میں ترسیل انسانی کی موجودہ قدر بھی

أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غْفِيلِينَ ﴿١٤٢﴾ أَوْ
تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِمَّنْ
بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ﴿١٤٣﴾ وَكَذَلِكَ

کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ”ہم تو اس بات سے بے خبر تھے“، یا یہ نہ کہنے لگو کہ ”شُرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا“ ^{۱۴۲} دیکھو، اِس طرح

پیدائش جتنی قریب از امکان ہے، اتنا ہی ازل میں ان کا مجموعی تصور، اور ابد میں ان کا مجموعی حشر و نشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحب عقل و شعور اور صاحب تصرف و اختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیت خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت سے آگاہی بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار (Oath of allegiance) لے۔ اس معاملہ کا پیش آنا قابل تعجب نہیں، البتہ اگر یہ پیش نہ آتا تو ضرور قابل تعجب ہوتا۔

۱۴۲ اس آیت میں وہ فرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسل آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ انہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں گویا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازل میں حد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوری انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہ واحد اور رب واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکل بے بری ہو سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازل میں اتفاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں محفوظ ہے، کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغاز آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا؟ سوال ہوا تھا اور اس نے بلی کہا تھا؛ اگر نہیں تو پھر اُس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور و حافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اِس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا ذہن کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنی ہی باقی

نہرہ جاتے۔ لہذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور (Sub-conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوة (Potentially) موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوة تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی جو اس کے اندر بالقوة موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب موثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوة موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محرک کریں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریکات و تیسعات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بالقوة موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی)، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوة موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔ ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیل (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے:

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں ابھرنا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو ابھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی اور ان کی پیروی کرتے والے داعیان حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

اسی لیے ان کو قرآن میں مذکور (یاد دلانے والے) ذکر (یاد مذکورہ) یادداشت، اور ان کے کام کو تذکیر (یاد دہانی) کے الفاظ سے

نُقِصِلُ الْآيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۴۳﴾ وَآتِلْ عَلَيْهِم نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ

ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔
اور اے محمدؐ، ان کے سامنے اُس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا

تغیر کیا گیا ہے جس کے سنی یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیان حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفسِ انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورتِ بلیک ملتا اس بات کا مزید ایک ثبوت۔ ہے کہ اندھنی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے ابھر آیا۔
پھر اسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشاتِ نفس اور تعصبات اور شیاطین جن دانش کی گمراہ کن تعلیمات تزییبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، السجاد، زندقہ اور اخلاقی و عملی فساد رونما ہوتا رہا ہے۔ لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوحِ دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر و تجدید کی کوششیں اُسے ابھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی جھت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور و حافظہ میں روزِ ازل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جبکہ انہوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علیٰ رؤس الاشهاد دکھا دے گا کہ انہوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبا یا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اُٹھیں، اپنی اور اپنے گرد و پیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیانِ حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ ابھرنے پر آمادہ ہوا، اور پھر وہ اپنے تعصبات اور اپنی خواہشاتِ نفس کی بنا پر کیسے کیسے جیلوں اور بانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کر دیتے رہے۔ وہ وقت جبکہ یہ سارے رازناش ہوں گے، جھت بازیوں کا نہ ہوگا بلکہ صاف صاف اقرارِ جرم کا ہوگا۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ اس وقت مہر میں یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، ایسی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا۔ وَشَهِدُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَنْهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الانعام، ۱۳۰)۔

۱۴۴ یعنی معرفتِ حق کے جو نشانات انسان کے اپنے نفس میں موجود ہیں ان کا صاف صاف پتہ دیتے ہیں۔

أَيُّنَا فَأَنْسَلَخَ مِنْهَا فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَوِينَ ﴿١٤٥﴾
 وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ
 هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحِمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثُ أَوْ
 تَتْرَكُهُ يَلْهَثُ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا
 یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے
 بلند دی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے
 پیچھے پڑا رہا، لہذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے
 رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات
 کو جھٹلاتے ہیں۔

۱۳۷ یعنی بغاوت و انحراف کی روش چھوڑ کر بندگی و اطاعت کے رویہ کی طرف واپس ہوں۔

۱۳۸ ان الفاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور کوئی متعین شخص ہو گا جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اللہ

اور اس کے رسول کی یہ اتہائی اخلاقی بندی ہے کہ وہ جب کبھی کسی کی برائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم اس کے
 نام کی تصریح نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر صرف اس کی بُری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اس کی رسوائی کے
 بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ اسی لیے نہ قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں کہ وہ شخص جس کی مثال یہاں
 پیش کی گئی ہے، کون تھا۔ مفسرین نے عہد رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کیا
 ہے۔ کوئی بلعم بن باعور اور کا نام لیتا ہے، کوئی امیہ بن ابی القسٹ کا، اور کوئی صیفی ابن الراحب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ
 خاص شخص تو پردہ میں ہے جو اس تمثیل میں پیش نظر تھا، البتہ یہ تمثیل ہر اس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت
 پائی جاتی ہو۔

۱۳۹ ان دو فقرے سے فقروں میں بڑا اہم مضمون ارشاد ہوا ہے جسے ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔

فَأَقْصِبِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۶۶﴾ سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنْفُسُهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۶۷﴾

تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں۔ بڑی ہی بڑی مثال ہے
ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔

وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، آیات الہی کا علم رکھتا تھا، یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا
چاہیے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے۔ اسی عمل مطابق علم کی
بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا۔ لیکن وہ دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آرائشوں کی طرف
جھک پڑا، خواہشات نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اُس نے ان کے آگے سپر ڈال دی، معالیٰ امور کی طلب میں
دنیا کی حرص و طمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص و طمع سے ایسا مغلوب ہوا کہ اپنے سب اُوچے ارادوں اور اپنی عقل و
اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو طلاق دے بیٹھا اور اُن تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی نگہداشت کا تقاضا خود
اُس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان جو قریب
ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا، اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر اُسے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف لے جاتا رہا یہاں تک
کہ ظالم نے اسے اُن لوگوں کے زمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاع عقل و ہوش
گم کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو گتے سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہر وقت نکل ہوئی زبان اور ٹیکتی ہوئی رال
ایک نہ بھنے والی آتش حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے۔ بنائے تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اُرد
زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، دنیا کا گتا کہتے ہیں گتے کی جبلت کیا ہے؟ حرص و آرزو۔ چلتے پھرتے
اس کی ناک زمین سو نگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوٹے طعام آجائے۔ اسے پھر مارے نب بھی اس کی یہ توقع دور
نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو بھینکی گئی ہے کوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو۔ پیٹ کا بندہ ایک دفعہ تو لپک کر اس کو بھی دانتوں
سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس سے بے التفاتی کیجیے تب بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لیے، زبان لٹکائے، ہانپتا
کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو وہ بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو جو کئی کتوں کے
کھانے کو کافی ہو تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لیے مخصوص رکھنا چاہیگا
اور کسی دوسرے کتے کو اس کے پاس نہ پھسکنے دے گا۔ اس شہوت شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ ہے شہوت
فروج۔ اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دل چسپی رکھتا ہے اور اسی کو سو نگھنے اور

مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيٌّ وَمَنْ يُضِلِّ فَأُولَئِكَ
 هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ
 وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ
 لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ
 كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ ﴿۱۴۹﴾

جسے اللہ ہدایت بخشتے بس وہی راہِ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے
 وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو
 ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے
 پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں
 وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں
 کھوئے گئے ہیں۔

چاہئے ہیں مشغول رہتا ہے۔ پس تشبیہ کا مدعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رستی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی
 خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتنے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شرمگاہ۔

۱۴۸ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اُن کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں اور ان کو
 وجود میں لاتے وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ انہیں دوزخ کا بندھن بنانا ہے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تو ان کو پیدا کیا تھا
 دل، دماغ، آنکھیں اور کان دے کر، مگر ظالموں نے ان سے کوئی کام نہ لیا اور اپنی غلط کاریوں کی بدولت آخر کار جہنم کا بندھن بن
 کر رہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے وہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو انسانی زبان میں انتہائی افسوس اور حسرت
 کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ماں کے متعدد جوان جوان بیٹے لڑائی میں جا کر لقمہ اجل ہو گئے ہوں تو
 وہ لوگوں سے کہتی ہے کہ میں نے انہیں اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ لوہے اور آگ کے کھیل میں ختم ہو جائیں۔ اس قول
 سے اس کا مدعا یہ نہیں ہوتا کہ واقعی اس کے پالنے پوسنے کی غرض یہی تھی، بلکہ اس حسرت بھرے انداز میں دراصل وہ کہتا ہے
 چاہتی ہے کہ میں نے تو اتنی محنتوں سے اپنا خون جگر پلا پلا کر ان بچوں کو پالا تھا، مگر خدا ان لڑنے والے فسادیوں سے سمجھے کہ میری

وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذُرُوا الَّذِينَ
يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۸۰﴾

اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو
اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔

محنت اور قربانی کے ثمرات یوں خاک میں مل کر رہے۔

۱۸۱۔ اب تقریر اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اس لیے خاتمہ کلام پر نصیحت اور ملامت کے طے جملے انداز میں لوگوں
کو ان کی چند نمایاں تزیینات پر متنبہ کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی پیغمبر کی دعوت کے مقابلہ میں انکار و استنہاز کا جو رویہ انہوں نے
اختیار کر رکھا تھا اس کی غلطی سمجھاتے ہوئے اس کے برے انجام سے انہیں خبردار کیا جا رہا ہے۔

۱۸۲۔ انسان اپنی زبان میں اشیاء کے جو نام رکھتا ہے وہ دراصل اس تصور پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں
ان اشیاء کے متعلق ہوا کرتا ہے۔ تصور کا نقص نام کے نقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نام کا نقص تصور کے نقص پر دلالت کرتا
ہے۔ پھر اشیاء کے ساتھ انسان کا تعلق اور معاملہ بھی لازماً اس تصور پر ہی مبنی ہوا کرتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں ان کے متعلق رکھتا ہے۔
تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے اور تصور کی صحت و درستی تعلق کی صحت و درستی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے۔ حقیقت
جس طرح دنیا کی تمام چیزوں کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح اللہ کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ اللہ کے لیے نام انخواہ وہ اسماء ذات
ہوں یا اسماء صفات، تجویز کرنے میں انسان جو غلطی بھی کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اس کے عقیدے کی
غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر خدا کے متعلق اپنے تصور و اعتقاد میں انسان جتنی اور جیسی غلطی کرتا ہے، اتنی ہی اور جیسی ہی غلطی اس سے
اپنی زندگی کے پورے اخلاقی رویہ کی تشکیل میں بھی سرزد ہوتی ہے کیونکہ انسان کے اخلاقی رویہ کی تشکیل تمام تر منحصر ہے اس تصور
پر جو اس نے خدا کے بارے میں اور خدا کے ساتھ اپنے اور کائنات کے تعلق کے بارے میں قائم کیا ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ خدا کے
نام رکھنے میں غلطی کرنے سے بچو، خدا کے لیے اچھے نام ہی موزوں ہیں اور اسے انہی ناموں سے یاد کرنا چاہیے، اس کے نام
تجویز کرنے میں الحاد کا انجام بہت بُرا ہے۔

”اچھے ناموں سے مراد وہ نام ہیں جن سے خدا کی عظمت و بزرگی، اس کے تقدس اور پاکیزگی اور اس کی صفات کمالیہ کا
اظہار ہوتا ہو۔ الحاد کے معنی ہیں وسط سے ہٹ جانا، سیدھے رخ سے منحرف ہو جانا۔ تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے
کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو مغربی میں کہتے ہیں اَلْحَدُ السَّهْمُ الْمَهْدُفُ، یعنی تیر نے نشانے سے الحاد کیا۔ خدا کے نام رکھنے
میں الحاد یہ ہے کہ خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب
اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں، یا جن سے اس کی ذات اقدس و اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝^{۱۸۱}
 وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝^{۱۸۲}
 وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ۝^{۱۸۳} أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا
 مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝^{۱۸۴}
 أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
 خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۗ وَإِنْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ

ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔ میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔

اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں ہے ان کے رفیق پر جنوں کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار ہے جو (برا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا ہے اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت

نیز یہ بھی الحاد ہی ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جائے جو صرف خدا ہی کے لیے موزوں ہو۔ پھر یہ جو فرمایا کہ اللہ کے نام رکھنے میں جو لوگ الحاد کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سیدھی طرح سمجھانے سے نہیں سمجھتے تو ان کی کج بختیوں میں تم کو الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی گمراہی کا انجام وہ خود دیکھ لیں گے۔

۱۸۳ رفیق سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ انہی لوگوں میں پیدا ہوئے، انہی کے درمیان رہے، بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبوت سے پہلے ساری قوم آپ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت

أَجْلَهُمْ فَيَأْتِي حَدِيثٌ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٥﴾ مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا
 هَادِيَ لَهُ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٨٦﴾ يَسْأَلُونَكَ
 عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا
 يُجِيبُهَا لَوْ قُبِلَتْ إِلَّا هُوَ نَقَلْتُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
 لَأَن تَأْتِيَكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ
 إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨٧﴾

قریب آگاہ ہو، پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کونسی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان
 لائیں؟۔۔۔ جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لیے پھر کوئی رہنما نہیں ہے، اور
 اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑے دیتا ہے۔

یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہو اس کا علم میرے
 رب ہی کے پاس ہے۔ اُسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت
 ہوگا۔ وہ تم پر اچانک آجائے گا۔ یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی
 کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔

سے جانتی تھی ربوت کے بعد جب آپ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپ کو جنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم جنون ان
 باتوں پر نہ تھا جو آپ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے بلکہ صرف انہی باتوں پر لگایا جا رہا تھا جن کی آپ نے نبی ہونے کے بعد تبلیغ شروع کی۔
 اسی وجہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے، آخر ان باتوں میں سے کونسی بات جنون کی ہے؟ کونسی بات بے نیکی،
 بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان وزمین کے نظام پر غور کرتے، یا خلک بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظر تامل دیکھتے تو انہیں خود
 معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگی رب کی دعوت اور انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کے بارے میں جو کچھ ان
 کا بھائی انہیں سمجھا رہا ہے اس کی صداقت پر یہ پورا نظام کائنات اور خلق اللہ کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے۔

۱۲۴ یعنی نادان اتنا بھی نہیں سوچتے کہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے، کچھ خبر نہیں کہ کب کس کی اجل آن پوری

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَ
 لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سَتَكُنْتُ مِنَ الْخَيْرِ شَيْءٌ وَمَا
 مَسَّنِي السُّوءُ إِنَّ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ
 يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۸﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ
 جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّهَا حَمَلَتْ
 حَمْلًا خَفِيًّا فَهَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَا اللَّهُ سَرَّهُمَا

اے محمد، ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اللہ اپنے رب کے دعا کی

ہو۔ پھر اگر ان میں سے کسی کا آخری وقت آگیا اور اپنے رب کی اصلاح کے لیے جو مہلت اسے ملی ہوئی ہے وہ انہی گرامیوں اور بڑا عملیوں میں ضائع ہو گئی تو آخر اس کا حشر کیا ہوگا۔

۱۲۵ مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ٹھیک تاریخ وہی بنا سکتا ہے جسے غیب کا علم ہو، اور میرا حال یہ ہے کہ میں کل کے متعلق بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ یا میرے بال بچوں کے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اگر یہ علم مجھے حاصل ہوتا تو میں کتنے نقصانات سے قبل از وقت آگاہ ہو کر بچ جاتا اور کتنے فائدے محض پیشگی علم کی بدولت اپنی ذات کے لیے سمیٹ لیتا پھر یہ تمہاری کتنی بڑی نادانی ہے کہ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ قیامت کب آئے گی

لَئِنْ آتَيْنَا صَالِحًا لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّا
 آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَاهُ لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَلَى اللَّهُ عَمَّا
 يُشْرِكُونَ ﴿١٩٠﴾ أَيُّ شُرَكَائِهِمْ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلِقُونَ ﴿١٩١﴾

کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔

۱۲۶ بیان مشرکین کی جاہلانہ گمراہیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ نوع انسانی کو ابتداء وجود بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس سے خود مشرکین کو بھی انکار نہیں۔ پھر ہر انسان کو وجود عطا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس بات کو بھی مشرکین جانتے ہیں۔ عورت کے رحم میں نطفے کو ٹھہرانا، پھر اس خفیف سے حمل کو پرورش کر کے ایک زندہ بچے کی صورت دینا، پھر اس بچے کے اندر طرح طرح کی قوتیں اور قابلیتیں و ربیت کرنا اور اس کو صحیح و سالم انسان بنا کر پیدا کرنا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر اللہ عورت کے پیٹ میں بندریا سانپ یا کوئی اور عجیب الخلقیت حیوان پیدا کر دے، یا بچے کو پیٹ ہی میں اندھا بہرا لنگڑا لولہ بنا دے، یا اس کی جسمانی و ذہنی اور نفسانی قوتوں میں کوئی نقص رکھ دے تو کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ کی اس ساخت کو بدل ڈالے۔ اس حقیقت سے مشرکین بھی اسی طرح آگاہ ہیں جس طرح موحّدین۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حمل میں ساری امیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہوتی ہیں کہ وہی صحیح و سالم بچہ پیدا کرے گا۔ لیکن اس پر بھی جہالت و نادانی کے طغیان کا یہ حال ہے کہ جب امید برآتی ہے اور چاند سا بچہ نصیب ہو جاتا ہے تو شکر یہ کہے لیے ندریں اور نیازیں کسی دیوی، کسی اذنا، کسی ولی اور کسی حضرت کے نام پر چڑھائی جاتی ہیں اور بچے کو ایسے نام دے جاتے ہیں کہ گو یادہ خدا کے سوا کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہے مثلاً حسین بخش، پیر بخش، عبدالرسول، عبدالعزیز، اور عبدالشمس وغیرہ۔

اس تقریر کے سمجھنے میں ایک بڑی غلط فہمی واقع ہوئی ہے جسے ضعیف روایات نے اور زیادہ تقویت پہنچا دی۔ چونکہ آغاز میں نوع انسانی کی پیدائش ایک جان سے ہونے کا ذکر آیا ہے، جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور پھر فوراً ہی ایک مرد و عورت کا ذکر شروع ہو گیا ہے جنہوں نے پہلے تو اللہ سے صحیح و سالم بچے کی پیدائش کے لیے دعا کی اور جب بچہ پیدا ہو گیا تو اللہ کی بخشش میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا، اس لیے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ شرک کرنے والے میاں بیوی ضرور حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہی ہوں گے۔ اس غلط فہمی پر روایات کا ایک خول چڑھ گیا اور ایک پورا قصہ تصنیف

وَلَا يَسْتَبِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿١٩٢﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ سِوَاءَ عَلَيْكُمْ أَدْعَاؤُهُمْ

جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں، تم خواہ انہیں پکارو یا خاموش رہو، دونوں صورتوں میں

کر دیا گیا کہ حضرت حوا کے بچے پیدا ہو کر مر جاتے تھے، آخر کار ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس کا نام عبد السموات (بندۃ شیطان) رکھ دیں۔ غضب یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچا دی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام روایات غلط ہیں اور قرآن کی عبارت بھی ان کی تائید نہیں کرتی۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نوع انسانی کا پہلا جوڑا جس سے آفرینش کی ابتدا ہوئی، اس کا خالق بھی اللہ ہی تھا، کوئی دوسرا اس کا تخلیق میں شریک نہ تھا، اور پھر ہر مرد و عورت کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کا خالق بھی اللہ ہی ہے جس کا اقرار تم سب لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ چنانچہ اسی اقرار کی بدولت تم امید و بیم کی حالت میں جب دعا مانگتے ہو تو اللہ ہی سے مانگتے ہو، لیکن بعد میں جب امیدیں پوری ہو جاتی ہیں تو تمہیں شرک کی سوجھنٹی ہے۔ اس تقریر میں کسی خاص مرد اور خاص عورت کا ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین میں سے ہر مرد اور ہر عورت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے وہ عرب کے مشرکین تھے اور ان کا تصور یہ تھا کہ وہ صحیح و سالم اولاد پیدا ہونے کے لیے تو خدا ہی سے دعا مانگتے تھے مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیہ میں دوسروں کو شکر لینے کا حصہ دار ٹھہرا لیتے تھے۔ بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بُری تھی۔ لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پاتا ہے وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں، حمل کے زمانے میں منگتے ہیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیا ز بھی انہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔ اس پر بھی نہ مانہ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ موجد ہیں، ان کے لیے جہنم واجب تھی اور ان کے لیے نجات کی گارنٹی ہے، ان کی گرامیوں پر تنقید کی۔ بائیں تیز ہیں مگر ان کی گرامیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کیا ہے:-

گرے غیر گریٹ کی پوجا تو کافر جو شیرائے پیا خدا کا تو کافر
چھکے آگ پر ہر سجدہ تو کافر کو اکب میں مانے کر شہد تو کافر
پہ ستنش کریں شوق سے جس کی چاہیں
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
مزاروں پر جا جا کے ندیں چڑھائیں شہیدوں کو جا جا کے بلکہیں عایش
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُونَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
 عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَاذْعُوْهُمْ فَلَيْسَتْ جِبُوًّا لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
 صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ اَللّٰهُمَّ اَرْجُلُ يَمْشُوْنَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ
 بِهَا اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يَّبْصُرُوْنَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اُذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا
 قُلْ اَدْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُوْنَ فَلَا تُنظِرُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنَّ
 وَّلِيَّ اللّٰهِ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

تمہارے لیے یکساں ہی رہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم
 بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو، یہ تمہاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں
 تمہارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں، کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟
 کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں، کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں، اسے محمدؐ، ان سے کہو کہ
 بلاو اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز ہمت نہ دو
 میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے،^{۱۶۰}

۱۶۷ یعنی ان مشرکین کے معبودان باطل کا حال یہ ہے کہ سیدھی راہ دکھانا اور اپنے پرستاروں کی رہنمائی کرنا تو درکنار، وہ

بیچارے تو کسی رہنمائی پیروی کرنے کے قابل بھی نہیں، حتیٰ کہ کسی پکارنے والے کی پکار کا جواب تک نہیں دے سکتے۔

۱۶۸ یہاں ایک بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے۔ مشرکانہ مذاہب میں تین چیزیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔ ایک

تو وہ اصنام، تصاویر یا علامات جو مزاج پرستش (Objects of worship) ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ اشخاص یا ارواح

یا معانی جو دراصل معبود قرار دیے جاتے ہیں اور جن کی نمائندگی اصنام اور تصاویر وغیرہ کی شکل میں کی جاتی ہے۔ تیسرے وہ اعتقاد

جو ان مشرکانہ عبادات و اعمال کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ قرآن مختلف طریقوں سے ان تینوں چیزوں پر ضرب لگاتا ہے۔ اس

مقام پہ اس کی تنقید کا رخ پہلی چیز کی طرف ہے یعنی وہ بت محل اعتراض ہیں جن کے سامنے مشرکین اپنے مراسم عبادت ادا

کرتے اور اپنی عرضیاں اور نیازیں پیش کرتے تھے۔

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا
 أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿١٩٤﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا
 وَتَرْهَمُ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٨﴾ خُذِ الْعَفْوَ
 وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾ وَإِنَّمَا يَنْزَعَنَّكَ
 مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٠٠﴾
 إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ ظِلْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا
 فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوهُمْ فِي الْغَيِّ

مخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی
 کرنے کے قابل ہیں، بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لیے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی
 نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی
 نہیں دیکھتے۔

اسے نبی، ترمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ
 الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے حقیقت میں
 جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے
 تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے
 رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لیے چلے جاتے ہیں

۱۷۹ یہ جواب ہے مشرکین کی ان دھمکیوں کا جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم ہمارے

ان معبودوں کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی طرف سے لوگوں کے عقیدے اسی طرح خراب کرتے رہے تو تم پر ان کا

ثُمَّ لَا يَقْصِرُونَ ۝ وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بآيَةٌ قَالُوا

اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اسے نبی، جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ

غضب ٹوٹ پڑے گا اور وہ تمہیں اُلٹ کر رکھ دیں گے۔

۱۵۔ ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضور ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضور کے ذریعہ سے ان سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضور کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے آئیں۔ ان نکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:-

۱۔ اداعی حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خواہ مخمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامتہ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رنفا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گہری درشت خوئی، تلخ گفتاری اور منمنقانہ اشتعال طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رخصا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کہے میں اس سے جرموں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں" اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو کرتے تھے جنہیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بشووا ولا تنفروا ولبسروا ولا تعسروا، یعنی "جہاں تم جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لیے مزوۃ جانفزا ہونے کہ باعث نفرت اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے" اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ قَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی نبی اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت ہو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے پھٹ جاتے۔ (آل عمران، ۱۵۹)

(۲) دعوت حق کی کامیابی کا گریہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معرفت یعنی ان سیدھی اور صاف بجلائیوں کی تلقین کرے جنہیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقول عام (Common sense) کا ن سرنی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعی حق کا اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتا ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ اب نکال لیتا ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شور و شکر برپا

کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان، خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں، تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعی حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخر کار میدان مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظام باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلید اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں سو فی صدی اور کہیں ۸۰ اور ۹۰ فی صدی باشندے مسلمان ہو گئے۔

(۳) اس دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبین خیر کو معرفت کی تلقین کی جائے وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ اُلجھا جائے خواہ وہ اُلجھنے اور اُلجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو عقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اتر آئے اور حجت بازی، جھگڑاؤں اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا صریح بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعت دعوت اور اصلاح نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

(۴) نمبر ۳ میں جو ہدایت کی گئی ہے اسی کے سلسلہ میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعی حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ترغ شیطانی (یعنی شیطان کی اکساہٹ) ہے اور اسی وقت غدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں نہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اُس سے دعوت حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوت حق کا کام بہر حال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔ لیکن شیطان جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کو شمش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعی حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اکساہٹے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے ماکثر بڑی بڑی پر فریبنا تاویلیوں اور مذہبی اصلاحوں کے غلاف میں لپٹا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہشمند) ہیں وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بڑے خیال کی کشک محسوس کرتے ہی فوراً چوکتے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوت دین کا مفاد کس طرز عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس جس وادی

لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي هَذَا
بَصَائِرٌ مِنْ شَرِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۰۲﴾

تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی، ان سے کہو "میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے تسلیم کریں۔"

میں شیطان چاہتا ہے انہیں لیے پھرتا ہے اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رکھتے۔ مخالف کی برکالی کے جواب میں ان کے پاس گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر چال موجود ہوتی ہے۔

اس ارشاد کا ایک عمومی عمل بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ بُرائی سے بچیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر ان کے دل کو چھو جاتا ہے تو انہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک آنکھ میں پھانس چھو جانے یا آنکھ میں کسی ذرے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اسی طرح خلافت مزاج ہوتی ہیں جس طرح آنکھ کے لیے ذرہ یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انہیں محسوس ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبارِ شر کو اپنے اوپر سے جھار دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہے، ان کے نفس میں بُرے خیالات، بُرے ارادے، بُرے مقاصد پختے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی آپریشن اپنے اندر محسوس نہیں کرتے بالکل اسی طرح جیسے کسی دیگی میں سور کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے، یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں گھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔

۱۵۱ کفار کے اس سوال میں ایک صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو اسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لیے بنا لائے ہوتے۔ لیکن آگے ملاحظہ ہو کہ اس طعن کا جواب کس نشان سے دیا جاتا ہے۔

۱۵۲ یعنی میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی میں خود ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کروں۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افزا روشنیاں



وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۲۳﴾
 وَذَكَرُوكُمْ رَبِّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ
 مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿۲۴﴾

جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔

اے نبی! اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الہی کے آثار صاف ہو پیدا ہونے لگتے ہیں۔

۱۵۳ یعنی یہ جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم لوگ قرآن کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور شور و غل برپا کرتے ہو تاکہ نہ خود سنو اور نہ کوئی دوسرا سن سکے، اس روش کو چھوڑ دو اور غور سے سنو تو سہی کہ اس میں تعلیم کی بادی گئی ہے۔ کیا عجب کہ اس کی تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد تم خود بھی اسی رحمت کے حصہ دار بن جاؤ جو ایمان لانے والوں کو نصیب ہو چکی ہے۔ مخالفین کی طعن آمیز بات کے جواب میں یہ ایسا لطیف و شیریں اور ایسا دلوں کو مسخر کرنے والا انداز تبلیغ ہے کہ اس کی خوبی کسی طرح بیان کی شتمل نہیں ہو سکتی۔ جو شخص حکمت تبلیغ سیکھنا چاہتا ہو وہ اگر غور کرے تو اس جواب میں بڑے سبق پاسکتا ہے۔

اس آیت کا اصل مقصود تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے لیکن ضمناً اس سے یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ جب خدا کا کلام پڑھا جا رہا ہو تو لوگوں کو ادب سے خاموش ہو جانا چاہیے اور توجہ کے ساتھ اسے سنا چاہیے۔ اسی سے یہ بات بھی مشتبط ہوتی ہے کہ امام جب نماز میں قرآن کی تلاوت کر رہا ہو تو مقتدیوں کو خاموشی کے ساتھ اس کی سماعت کرنی چاہیے۔ لیکن اس مسئلہ میں ائمہ کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ امام کی قرأت خواہ جہری ہو یا ستری، مقتدیوں کو خاموش ہی رہنا چاہیے۔ امام مالک اور امام احمد کی رائے یہ ہے کہ صرف جہری قرأت کی صورت میں مقتدیوں کو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن امام شافعی اس طرف گئے ہیں کہ جہری اور ستری دونوں صورتوں میں مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے کیونکہ بعض احادیث کی بنا پر وہ سمجھے ہیں کہ جو شخص نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ
وَيَسْبِحُونَ لَهُ يَبْجِدُونَ

ع الجدة
۲۰۶

جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھنڈ میں
آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے
جھکے رہتے ہیں۔

۱۵۴ یاد کرنے سے مراد نماز بھی ہے اور دوسری قسم کی یاد بھی، خواہ وہ زبان سے ہو یا خیال سے۔ صبح و شام سے
مراد یہی دونوں وقت بھی ہیں اور ان اوقات میں اللہ کی یاد سے مقصود نماز ہے، اور صبح و شام کا لفظ "دائماً" کے معنی میں بھی
استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہنا ہے۔ یہ آخری نصیحت ہے جو خطبہ کو ختم کرتے ہوئے ارشاد
فرمائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمہارا حال کہیں غافلوں کا سانہ ہو جائے۔ دنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان
کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا اس کا رب ہے
اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دنیا میں اس کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب
دینا ہوگا۔ پس جو شخص راہ راست پر چلنا اور دنیا کو اس پر چلانا چاہتا ہو اس کو سخت اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں خود اس کو
لاحق نہ ہو جائے۔ اسی لیے نماز اور ذکر الہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

۱۵۵ مطلب یہ ہے کہ بڑائی کا گھنڈ اور بندگی سے منہ موڑنا شیبا طین کا کام ہے اور اس کا نتیجہ پستی و منزل ہے۔
بخلاف اس کے خدا کے آگے جھکنا اور بندگی میں ثابت قدم رہنا ملکوتی فعل ہے اور اس کا نتیجہ ترقی و بلندی اور خدا سے تقرب ہے۔
اگر تم اس ترقی کے خواہشمند ہو تو اپنے طرز عمل کو شیبا طین کے بجائے ملائکہ کے طرز عمل کے مطابق بناؤ۔

۱۵۶ تسبیح کرتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا بے عیب اور بے نقص اور بے خطا ہونا، ہر قسم کی کمزوریوں سے اس کا منہ
ہونا، اور اس کا لاشریک اور بے مثل اور بے ہمتا ہونا دل سے مانتے ہیں، اس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں اور دائماً اس کے
اظہار و اعلان میں مشغول رہتے ہیں۔

۱۵۷ اس مقام پر حکم ہے کہ جو شخص اس آیت کو پڑھے یا سنے وہ سجدہ کرے تاکہ اس کا حال ملائکہ مقربین کے
حال سے مطابق ہو جائے اور ساری کائنات کا انتظام چلانے والے کارکن جس خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں اسی کے آگے
وہ بھی ان سب کے ساتھ جھک جائے اور اپنے عمل سے قوراً یہ ثابت کر دے کہ وہ نہ تو کسی گھنڈ میں مبتلا ہے اور نہ خدا کی بندگی
سے منہ موڑنے والا ہے۔

قرآن مجید میں ایسے ۱۴ مقامات ہیں جہاں آیات سجدہ آئی ہیں۔ ان آیات پر سجدہ کا مشروع ہونا تو متفق علیہ ہے

مگر اس کے وجوب میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سجدہ تلاوت کو واجب کہتے ہیں اور دوسرے علماء نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا اوقات ایک بڑے مجمع میں قرآن پڑھتے اور اس میں جب آیت سجدہ آتی تو آپ خود بھی سجدہ میں گر جاتے تھے اور جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا تھا، حتیٰ کہ کسی کو سجدہ کرنے کے لیے جگہ نہ ملتی تو وہ اپنے آگے والے شخص کی پیٹھ پر سر رکھ دیتا۔ یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے موقع پر قرآن پڑھا اور اس میں جب آیت سجدہ آئی تو جو لوگ زمین پر کھڑے تھے انہوں نے زمین پر سجدہ کیا اور جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے وہ اپنی سواروں پر ہی تھک گئے۔ کبھی آپ نے دوران خطبہ میں آیت سجدہ پڑھی ہے تو منبر سے اتر کر سجدہ کیا ہے اور پھر اوپر جا کر خطبہ شروع کر دیا ہے۔

اس سجدے کے لیے جمہور انہی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرطیں ہیں، یعنی با وضو ہونا، قبلہ رخ ہونا، اور نماز کی طرح سجدے میں زمین پر سر رکھنا۔ لیکن جتنی احادیث سجود تلاوت کے باب میں ہم کو ملی ہیں ان میں کہیں ان شرطوں کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیت سجدہ سن کر جو شخص جہاں جس حال میں ہو تھک جائے، خواہ با وضو ہو یا نہ ہو، خواہ استقبال قبلہ ممکن ہو یا نہ ہو، خواہ زمین پر سر رکھنے کا موقع ہو یا نہ ہو، سلف میں بھی ہم کو ایسی شخصیتیں ملتی ہیں جن کا عمل اس طریقے پر تھا۔ چنانچہ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدہ تلاوت کرتے تھے۔ اور ابو عبد الرحمن سلمیٰ کے متعلق فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے قرآن مجید پڑھتے جاتے تھے اور اگر کہیں آیت سجدہ آجاتی تو بس سر جھکا لیتے تھے، خواہ با وضو ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ قبلہ رخ بھی ہوں یا نہ ہوں۔ ان وجوہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ مبنی بر احتیاط مسلک جمہور ہی کا ہے، لیکن اگر کوئی شخص جمہور کے مسلک کے خلاف عمل کرے تو اسے ملامت بھی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ جمہور کی تائید میں کوئی سنت ثابتہ موجود نہیں ہے، اور سلف میں ایسے لوگ پائے گئے ہیں جن کا عمل جمہور کے مسلک سے مختلف تھا۔

